ذوالقعدہ ۱۴۳۳ھ

اکتوبر ۲۰۱۲ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

ے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

ں: ڈاکٹر اسرار احمد

ایمان بالقدر (تقدیر پر ایمان)

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ علیہ

یوم عشقِ رسولؐ اور میڈیا کا گھناؤنا کردار

ایوب بیگ مرزا

داعی رجوع الی القرآن بانیِ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سورۃ الفاتحہ و سورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن

(چھٹا ایڈیشن) ــــــــــ صفحات:360، قیمت 450روپے

حصہ دوم سورۃ آلِ عمران تا سورۃ المائدہ

(چوتھا ایڈیشن) ــــــــــ صفحات 321، قیمت 400روپے

حصہ سوم سورۃ الانعام تا سورۃ التوبہ

(دوسرا ایڈیشن) ــــــــــ صفحات 331، قیمت 400روپے

حصہ چہارم سورۃ یونس تا سورۃ الکہف

(پہلا ایڈیشن) ــــــــــ صفحات394، قیمت450روپے

★عمدہ طباعت ★ دیدہ زیب ٹائٹل اور مضبوط جلد ★ امپورٹڈ پیپر

ملنے کے پتے

انجمن خُدّام القرآن خیبر پختونخوا پشاور

A-18ناصر مینشن، ریلوے روڈ نمبر2، شعبہ بازار پشاور فون: 2584824,2214495(091)

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور فون 3-35869501(042)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ علیہ

جلد :	61
شمارہ :	10
ذوالقعدہ	1433ھ
اکتوبر	2012ء
فی شمارہ	-/25

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

اندرون ملک	250 روپے
بھارت و بنگلہ دیش	900 روپے
ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ	1200 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700، فون: 3-35869501
فیکس: 35834000 ای میل: publications@tanzeem.org
ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور
فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36313131

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مجلد جدید پریس (پرائیویٹ) چنگا

مشمولات

عرضِ احوال ———— 3
یوم عشق رسولؐ اور میڈیا کا گھناؤنا کردار
ایوب بیگ مرزا

بیانُ القُرآن ———— 5
سورۂ یونس (آیات ۱ تا ۳۰)
ڈاکٹر اسرار احمدؒ

منبر و محراب ———— 25
ایمان بالقدر (تقدیر پر ایمان)
ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تعمیرِ سیرت ———— 55
ایمان اور عمل صالح
عتیق الرحمٰن صدیقی

فکرِ تنظیم ———— 65
ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی امتیازی آراء (۲)
انجینئر نوید احمد

حقوق و فرائض ———— 86
قرآن کے حقوق اور ہمارے فرائض
بیگم ڈاکٹر عبدالخالق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یومِ عشقِ رسولؐ اور میڈیا کا گھناؤنا کردار

ایک بزرگ کا قول ہے کہ دنیا کا کوئی بھی انسان دنیا کی کسی بھی زبان میں نبی اکرم ﷺ کی ثنا خوانی کرے‘ آپؐ کی صفات و کمالات بیان کرے‘ ممکن نہیں کہ اس کا حق ادا کر سکے۔ اس لیے کہ انسان کی محدود سوچ اور تحریر و تقریر کی محدود صلاحیت نبی اکرم ﷺ جو امتناعِ نظیر ہیں‘ جو بے مثل ہیں‘ کی ہمہ گیر شخصیت اور آپؐ کے اوصافِ حمیدہ کا مکمل احاطہ نہیں کر سکے گی‘ کوئی نہ کوئی پہلو تشنہ رہ جائے گا۔ کہیں علم کی کمی آڑے آئے گی اور کہیں زبان و بیان کی۔ اسی لیے علمائے کرام سیرتِ مطہرہ پر مفصل گفتگو کرنے کے بعد اس مصرع میں پناہ لیتے ہیں: ع ’’بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر‘‘ اور غالب جیسا زبان دان اور قادر الکلام یہ کہہ کر ہتھیار ڈال دیتا ہے ؎

غالب ثنائے خواجہؐ بیزداں گزاشتیم
کآں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

عام مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اللہ کی سنت کی پیروی کرتے ہوئے حضور ﷺ پر درود بھیجتا رہے۔ یہ امتی کا حضور ﷺ سے رشتہ مضبوط کرتا ہے اور اُس کی اخروی نجات کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔

ہمیں جب بھی سیرتِ پاک کے حوالہ سے کوئی تحریر لکھنا ہوتی ہے تو قلم تھرتھر کانپنے لگتا ہے۔ احساسِ کمتری کچھ اس انداز سے ذہن پر چھا جاتا ہے کہ لکھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ لیکن ایک کام یقیناً اس سے بھی زیادہ مشکل اور بہت مشکل ہے۔ وہ یہ کہ کسی شاتمِ رسول کی مذمت‘ اس کے فعل سے اظہارِ نفرت اس شدت اور اس انداز سے کیا جائے جس کا وہ حق رکھتا ہے۔ ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ دنیا کے کسی بھی شریف النفس اور دیانت دار لکھاری کے بس کی بات نہیں ہے۔ بینک فراڈ میں ملوث مجرمانہ ذہنیت کے حامل ایک اسرائیلی نژاد امریکی اور اس کے ساتھیوں نے اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہوئے ایک فلم کے ذریعے کائنات کی مقدس ترین ہستی پر کیچڑ اچھالنے کی ناپاک اور ناکام کوشش کی ہے۔ جہاں تک اس فعل کی مذمت کرنا اور اسے ہدفِ تنقید بنانا ہے‘ ہم سطورِ بالا میں عرض کر چکے ہیں اس کے لیے ایسے صحیح‘ انتہائی مؤثر اور واضح الفاظ استعمال کرنا کہ مذمت کا حق ادا ہو جائے ممکن ہی نہیں۔ لہٰذا ہم اس بدکردار‘ بدگو‘ فاسق و فاجر انسان نما مخلوق کا معاملہ اللہ رب العزت پر چھوڑتے ہیں کہ اللہ ہی انہیں وہ سزا دینے پر قادر ہے جس کے وہ حق دار ہیں۔ قرآن کریم کی سورۃ الحجر کی آیت ۹۵ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ’’(اے نبی ﷺ) ہم آپ کو اُن لوگوں (کے شر) سے

بچانے کے لیے جو آپ سے استہزاء کرتے ہیں‘ کافی ہیں‘‘۔ اولاً ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ دشمنانِ اسلام کی طرف سے آئے روز ایسی حرکات کیوں ہو رہی ہیں کہ کبھی قرآنی اوراق کی بے حرمتی کی جاتی ہے‘ کبھی بدبخت ٹیری جونز قرآن جلاتا ہے‘ کبھی آقائے نامدار ﷺ کے خاکے شائع کیے جاتے ہیں۔ آپؐ کی ذاتِ مبارک پر سوانحی فلم بنانا ہی توہین آمیز فعل ہے چہ جائیکہ اس میں جھوٹا اور غلیظ مواد شامل کیا جائے۔ اور ثانیاً یہ کہ اللہ اور اس کے رسول کے ان دشمنوں اور شیطان کے پیروکاروں سے کیسے نمٹا جائے۔ لیکن اس حوالہ سے اپنی رائے کے اظہار سے پہلے ہم یہ بھی اپنا قومی اور ملی فریضہ سمجھتے ہیں کہ جو لوگ اس احتجاج کی آڑ میں املاک کو جلا رہے ہیں اور لوگوں کی گاڑیاں توڑ رہے ہیں‘ اور پولیس پر پتھراؤ کرتے ہیں ان کی بھرپور مذمت کریں‘ اس لیے کہ وہ غیر شعوری طور پر دشمنانِ دین کے ایجنڈے کی تکمیل کر رہے ہیں۔ ہم اپنے ملک میں تخریب کاری کریں گے تو انہیں اور کیا چاہیے۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ بدبخت اور بدطینت لوگ مزید ایسی مذموم حرکات کریں گے تاکہ ہم اپنے ملک میں گھیراؤ جلاؤ کرتے رہیں اور وہ اپنا ایجنڈا آگے بڑھا سکیں۔

اگر قارئین برا نہ منائیں تو ہم یہ کہنے کی جرأت کریں گے کہ ہم نام کے مسلمان خود اس کے ذمہ دار ہیں۔ ملعون سلمان رشدی نے زندگی میں ایک ہی سچ بولا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر مجھے قتل کر دیا جاتا تو ایسی فلم بننے کی نوبت نہ آتی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ملعون سلمان رشدی ایک سمبل ہے‘ ایک شیطانی نظام کا سمبل۔ یہ دنیوی اور ظاہری لحاظ سے بہت مضبوط اور طاقتور نظام ہے۔ اس شیطانی نظام سے ٹکر لیے بغیر اور اس سے تصادم مول لیے بغیر ہم ایسی مذموم‘ قابل نفرت اور اشتعال انگیز حرکات کا خاتمہ نہیں کر سکیں گے۔ لیکن ہم تو وہ کچھ بھی نہیں کر پا رہے جو حالت کمزوری میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ اگر ستاون اسلامی ملک یہ اعلان کر دیں کہ عالمی سطح پر یہ قانون بنایا جائے کہ انبیاء و رسل اور الہامی کتابوں کی بے حرمتی اور توہین نہیں کی جا سکتی اور جو ملک یہ قانون نہیں بنائے گا تمام اسلامی ممالک اس سے اپنے سفارتی اور تجارتی تعلقات منقطع کر لیں گے‘ تو مغربی دنیا کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ مسلمان حکمران اور سیکولر عناصر یہ تجویز سن کر امریکہ اور یورپ کے خوف سے کانپنے لگیں گے۔ مرعوب ذہنیت اور عملیت پسندی کب انہیں ایسا اقدام کرنے دے گی۔ لیکن ان لوگوں سے ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا اسلام دشمن قوتیں محض سفارتی اور تجارتی تعلقات توڑ لینے پر ستاون مسلمان ممالک کو نیست و نابود کر دیں گی؟ یہ ناممکن ہے! اس لیے کہ ان قوتوں کے بھی مسلمان ممالک سے مفادات وابستہ ہیں۔ مسائل ضرور کھڑے ہوں گے‘ تکالیف اور مصائب کا ضرور سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن امتِ مسلمہ ڈٹ جائے اور پسپائی اختیار کرنے سے صاف صاف انکار کر دے تو کم از کم یہ مطالبہ تسلیم کرنا بڑی قوتوں کی مجبوری بن جائے گا۔ البتہ یہ کہ اسلام دشمن قوتوں کا مستقل بنیادوں پر مقابلہ کرنے کے لیے امتِ مسلمہ کے لیے دندان شکن قوت بننا ناگزیر ہے۔ اس لیے کہ قرآن پاک نے

(باقی صفحہ 95 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃ یُونُس

تمہیدی کلمات

سورۂ یونس کے آغاز کے ساتھ ہی قرآن حکیم کی تیسری منزل بھی شروع ہو رہی ہے اور یہیں سے مکی مدنی سورتوں کے تیسرے گروپ کا آغاز بھی ہو رہا ہے۔ اس لحاظ سے قرآن کا یہ مقام گویا ''قران السعدین'' ہے۔ مکی سورتوں کا یہ سلسلہ جو سورۂ یونس سے شروع ہو کر سورۃ المؤمنون (اٹھارہویں پارہ) تک پھیلا ہوا ہے' حجم کے اعتبار سے طویل ترین ہے۔ (البتہ تیسویں پارے کی سورتیں چونکہ چھوٹی چھوٹی ہیں اس لیے تعداد کے لحاظ سے سب سے زیادہ مکی سورتیں آخری گروپ میں ہیں۔) اس گروپ میں شامل سورۃ الحجر اور سورۃ الحج کے بارے میں بعض مفسّرین کی رائے ہے کہ یہ دونوں مدنیات ہیں' مگر اس سلسلے میں مجھے اُن مفسّرین سے اتفاق ہے جو ان دونوں کو مکیات مانتے ہیں۔

ان پہلے تین گروپس میں شامل سورتوں کی مکی اور مدنی تقسیم کے حوالے سے بات کی جائے تو جس طرح پہلے گروپ میں سورۃ البقرۃ سے لے کر سورۃ المائدۃ تک سوا چھ پاروں پر مشتمل چھ سورتیں مدنی تھیں' اسی طرح اب اس گروپ میں آئندہ سات پاروں پر مشتمل مسلسل چودہ سورتیں مکی ہیں' جب کہ درمیانی گروپ دو مکی (الانعام اور الاعراف) اور دو مدنی (الانفال اور التوبہ) سورتوں پر مشتمل تھا۔

اس گروپ کی ان چودہ سورتوں میں اکثر و بیشتر تین تین سورتوں کے ذیلی گروپ بھی بنتے ہیں' جن میں سے ہر گروپ کی پہلی دو سورتوں کے مابین نسبتِ زوجیت پائی جاتی ہے' جبکہ تیسری سورت منفرد ہے۔ پہلے ذیلی گروپ میں شامل تین سورتیں نسبتاً طویل ہیں' ان کے بعد تین نسبتاً چھوٹی سورتوں کا ایک ذیلی گروپ ہے اور اس کے بعد پھر تین سورتوں کا ایک ذیلی

گروپ ہے جو قدرے طویل ہیں۔ پہلا ذیلی گروپ سورۂ یونس' سورۂ ہود اور سورۂ یوسف پر مشتمل ہے۔ ان میں سورۂ یونس اور سورۂ ہود کا آپس میں زوجیت کا بالکل ویسا ہی تعلق ہے جیسا کہ سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف میں ہے۔ چنانچہ سورۂ یونس کے گیارہ رکوعوں میں سے صرف دو رکوع انباء الرُّسل سے متعلق ہیں اور باقی نو رکوع التذکیر بِآلاء اللّٰہ پر مشتمل ہیں' جبکہ دوسری طرف سورۂ ہود کے دس رکوعوں میں سے ساڑھے چھ رکوع انباء الرسل (التذکیر بایّام اللّٰہ) سے متعلق ہیں اور صرف ساڑھے تین رکوعوں میں دوسرے مضامین ہیں' جن میں کفار کے ساتھ ردّوقدح بھی ہے اور التذکیر بِآلاء اللّٰہ کا مضمون بھی ہے۔ اس ذیلی گروپ میں سورۂ یوسف کی حیثیت گویا ایک ضمیمے کی ہے' جو ان سے الگ اور بالکل منفرد ہے۔

سورۂ یونس اور سورۂ ہود میں زوجیت کے تعلق میں ایک عجیب متلازم (reciprocal) نسبت بھی ہے کہ سورۂ یونس میں انباء الرسل کے دو رکوعوں میں سے صرف آدھے رکوع (چند آیات) میں حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر ہے اور باقی ڈیڑھ رکوع حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہے' جبکہ درمیان کے کسی رسول کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس کے بالکل برعکس سورۂ ہود میں پورے دو رکوع حضرت نوح علیہ السلام کے ذکر پر مشتمل ہیں۔ یہ مقام حضرت نوح علیہ السلام کے ذکر کے اعتبار سے پورے قرآن میں جامع ترین بھی ہے اور افضل بھی۔ (اگرچہ انیسویں پارے میں سورۂ نوحؑ مکمل آپؑ ہی کے ذکر پر مشتمل ہے' مگر وہاں وہ تفاصیل نہیں ہیں جو یہاں پر ہیں۔) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر اس سورت میں چند آیات میں صرف حوالے کے لیے ہی آیا ہے' جبکہ درمیان میں انباء الرسل کے سلسلے میں ایک ایک رکوع میں ایک ایک رسولؑ کا ذکر ہے۔

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

آیات ۱ تا ۱۰

الٓرٰ ۟ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ۭ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ
يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا
لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ
الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ
وَالْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّ
فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يَّتَّقُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا
سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

آیت ۱ ﴿الٓرٰ﴾ ''ا‘ ل‘ ر‘''

یہ حروفِ مقطعات ہیں۔ یہاں پر ایک قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ اس سے پہلے سورۃ البقرۃ‘ سورۂ آل عمران اور سورۃ الاعراف تین سورتوں کا آغاز حروفِ مقطعات (الٓمّٓ‘ الٓمّٓصٓ) سے ہوتا ہے اور ان تینوں مقامات پر حروفِ مقطعات پر آیت مکمل ہو جاتی ہے‘ مگر یہاں ان حروف پر آیت مکمل نہیں ہو رہی ہے‘ بلکہ یہ پہلی آیت کا حصہ ہیں۔ بہر حال یہ تو قیفی امور (حضور ﷺ کے بتانے پر موقوف) ہیں۔ گرائمر‘ منطق‘ نحو‘ بیان وغیرہ کے کسی اصول یا قاعدے کو یہاں دخل نہیں ہے۔

﴿تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝١﴾ ''یہ بڑی حکمت بھری کتاب کی آیات ہیں۔''

آیت ۲ ﴿اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ﴾ ''کیا لوگوں کو بہت تعجب ہوا ہے کہ ہم نے وحی بھیج دی ایک شخص پر انہی میں سے''

﴿اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ﴾ ''کہ آپؐ لوگوں کو خبردار کر دیجیے اور اہل ایمان کو بشارت دے دیجیے کہ ان کے لیے ان کے رب کے پاس بہت اونچا مرتبہ ہے۔''

﴿قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ۝٢﴾ ''(اس پر) کافروں نے کہا کہ یہ تو ایک کھلا جادوگر ہے۔''

یعنی یہ تو اللہ کی مرضی پر منحصر ہے۔ اس کا فیصلہ ہے کہ وہ اس منصب کے لیے انسانوں میں سے جس کو چاہے پسند فرما کر منتخب کر لے۔ اگر اس نے محمد ﷺ کا انتخاب کر کے آپ ﷺ کو بذریعہ وحی انذار اور تبشیر کی خدمت پر مامور کیا ہے تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے!

آیت ۳ ﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ﴾ ''یقیناً تمہارا رب وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق فرمائی چھ دنوں میں''

﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ﴾ ''پھر وہ عرش پر متمکن ہو گیا‘ (اور) وہ تدبیر کرتا ہے ہر معاملہ کی۔''

اللہ تعالیٰ اپنی مشیت اور منصوبہ بندی کے مطابق پوری کائنات کا انتظام سنبھالے ہوئے ہے۔ قبل ازیں بھی ذکر ہو چکا ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے بابِ اول میں اللہ تعالیٰ کے تین افعال کے بارے میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے: (۱) ابداع (creation ex nehilo) یعنی کسی چیز کو عدم محض سے وجود بخشنا‘ (۲) خلق‘ یعنی کسی چیز سے کوئی دوسری چیز بنانا‘ اور (۳) تدبیر‘ یعنی اپنی مشیت اور حکمت کے مطابق کائناتی نظام کی منصوبہ بندی (planning) فرمانا۔

﴿مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ﴾ ''نہیں ہے کوئی بھی شفاعت کرنے والا مگر اس کی اجازت کے بعد۔''

کوئی اُس کا اذن حاصل کیے بغیر اُس کے پاس کسی کی سفارش نہیں کر سکتا۔ اس سے پہلے آیت الکرسی (سورۃ البقرۃ) میں بھی شفاعت کے بارے میں اسی نوعیت کا استثناء آ چکا ہے۔

﴿ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝٣﴾ ''وہ ہے اللہ تمہارا رب‘ پس تم اسی کی بندگی کرو۔ تو کیا تم نصیحت اخذ نہیں کرتے!''

آیت ۴ ﴿اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ﴾ ''تم سب کا لوٹنا اُسی کی جانب ہے۔ یہ وعدہ ہے اللہ کا سچا۔''

﴿اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ﴾ ''وہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے‘ پھر وہی اس کا

اعادہ کردے گا‘‘

پہلے پہل کسی کام کا کرنا یا ابتدائی طور پر کسی چیز کو تخلیق کرنا مشکل ہوتا ہے جبکہ اس کا اعادہ کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ یہ ایک معقول اور منطقی بات ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہی نے یہ سب کچھ پیدا فرمایا ہے اور پہلی بار اسے اس تخلیق میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تو دوبارہ پیدا کرنا اس کے لیے کیونکر مشکل ہو جائے گا! بہرحال وہ تمام انسانوں کو دوبارہ پیدا کرے گا:

﴿لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ۭ﴾ ’’تاکہ وہ ان لوگوں کو جزا دے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے عمل کیے انصاف کے ساتھ۔‘‘

وہ اہلِ ایمان جنہوں نے اللہ اور اُس کے دین کے لیے ایثار کیا ہے‘ ان کی قربانیوں اور مشقتوں کے بدلے میں انہیں انعامات سے نوازا جائے گا اور ان کے ان اعمال کی پوری پوری قدر کی جائے گی۔

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝﴾ ’’اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے پینے کے لیے ہوگا کھولتا ہوا پانی اور دردناک عذاب‘ اس کفر کی پاداش میں جو وہ کرتے رہے۔‘‘

آیت ۵ ﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاۗءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا﴾ ’’وہی ہے جس نے بنایا سورج کو چمکدار اور چاند کو نور‘‘

یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ سورج کے اندر جاری احتراق یعنی جلنے (combustion) کے عمل کی وجہ سے جو روشنی پیدا (generate) ہو رہی ہے اس کے لیے ’’ضیاء‘‘ جبکہ منعکس (reflect) ہو کر آنے والی روشنی کے لیے ’’نور‘‘ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ سورج اور چاند کی روشنی کے لیے قرآن حکیم نے دو مختلف الفاظ استعمال کیے ہیں‘ اس لیے کہ سورج کی اپنی چمک ہے اور چاند کی روشنی ایک انعکاس ہے۔

﴿وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۭ﴾ ’’اور اُس نے اس (چاند) کی منزلیں مقرر کر دیں تاکہ تمہیں معلوم ہو گنتی برسوں کی اور تم (معاملاتِ زندگی میں) حساب کر سکو۔‘‘

﴿مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝﴾ ’’اللہ

نے یہ سب کچھ پیدا نہیں کیا مگر حق کے ساتھ‘ اور وہ تفصیل بیان کرتا ہے اپنی آیات کی ان لوگوں کے لیے جو علم حاصل کرنا چاہیں۔‘‘

یعنی یہ کائنات ایک بے مقصد تخلیق نہیں بلکہ ایک سنجیدہ‘ بامقصد اور نتیجہ خیز تخلیق ہے۔

آیت ۶ ﴿اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ۝﴾ ’’یقیناً رات اور دن کے ادلنے بدلنے میں اور جو کچھ اللہ نے بنایا ہے آسمانوں میں اور زمین میں‘ یقیناً نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جن کے اندر تقویٰ ہے۔‘‘

ان نشانیوں سے وہی لوگ سبق حاصل کر کے مستفیض ہو سکتے ہیں جن کے اندر خوفِ خدا ہے اور ان کی اخلاقی حس بیدار ہوتی ہے۔

آیت ۷ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاۗءَنَا﴾ ’’بے شک وہ لوگ جو ہم سے ملاقات کے امیدوار نہیں ہیں‘‘

یہاں پر یہ نکتہ نوٹ کریں کہ یہ الفاظ اس سورت میں بار بار دہرائے جائیں گے۔ اصل میں یہ ایسی انسانی سوچ اور نفسیاتی کیفیت کی طرف اشارہ ہے جس کے مطابق انسانی زندگی ہی اصل زندگی ہے۔ انسان کو غور کرنا چاہیے کہ یہ انسانی زندگی جو ہم اس دنیا میں گزار رہے ہیں اس کی اصل حقیقت کیا ہے! اسے محاورۃً ’’چار دن کی زندگی‘‘ قرار دیا جاتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر نے بھی کہا ہے ؎

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے‘ دو انتظار میں!

اگر انسان اس دُنیا میں طویل طبعی عمر بھی پائے تو اس کا ایک حصہ بچپن کی ناسمجھی اور کھیل کود میں ضائع ہو جاتا ہے۔ شعور اور جوانی کی عمر کا تھوڑا سا وقفہ اس کے لیے کارآمد ہوتا ہے۔ اس کے بعد جلد ہی بڑھاپا اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے ﴿لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـــًٔا ۭ﴾ (النحل:۷۰) کی جیتی جاگتی تصویر بن کر رہ جاتا ہے۔ تو کیا انسانی زندگی کی حقیقت بس یہی ہے؟ اور کیا اتنی سی زندگی کے لیے ہی انسان کو اشرف المخلوقات کا لقب دیا جاتا ہے؟ انسان غور کرے تو اس پر یہ حقیقت واضح ہو گی کہ انسانی زندگی محض ہمارے سامنے کے چند ماہ وسال کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والے سلسلے کا نام ہے۔ علامہ اقبال کے بقول:

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

اور اقبالؔ ہی نے اس سلسلے میں انسانی ناسمجھی اور کم ظرفی کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے:

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے!

اس لامتناہی سلسلۂ زندگی میں سے ایک انتہائی مختصر اور عارضی وقفہ یہ دُنیوی زندگی ہے جو اللہ نے انسان کو آزمانے اور جانچنے کے لیے عطا کی ہے: ﴿اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ (الملک:۲)۔ جبکہ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے اور وہ بہت طویل ہے۔ جیسے سورۃ العنکبوت میں فرمایا: ﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ ۘ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴿۶۴﴾﴾ ''اور یقیناً آخرت کا گھر ہی اصل زندگی ہے، کاش کہ انہیں معلوم ہوتا!'' مگر وہ لوگ جن کا ذہنی اُفق تنگ اور سوچ محدود ہے، وہ اسی عارضی اور مختصر وقفۂ زندگی کو اصل زندگی سمجھ کر اس کی رعنائیوں پر فریفتہ اور اس کی رنگینیوں میں گم رہتے ہیں۔ بقولِ علامہ اقبالؔ:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مؤمن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق!

اصل اور دائمی زندگی کی عظمت اور حقیقت ایسے لوگوں کی نظروں سے بالکل اوجھل ہو چکی ہے۔

﴿وَرَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِھَا وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ﴿۷﴾﴾

''اور وہ دنیا کی زندگی پر ہی راضی اور اسی پر مطمئن ہیں، اور جو ہماری آیات سے غافل ہیں۔''

انسانوں کے اندر اور باہر اللہ کی بے شمار نشانیاں موجود ہیں اور ان کی فطرت انہیں بار بار دعوتِ فکر بھی دیتی ہے:

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ!
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

مگر وہ لوگ شہواتِ نفسانی کے چکروں میں اس حد تک غلطاں و پیچاں ہیں کہ انہیں آنکھ کھول کر انفس و آفاق میں بکھری ہوئی ان لاتعداد آیاتِ الٰہی کو ایک نظر دیکھنے کی فرصت ہے نہ توفیق۔

آیت ۸ ﴿اُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ﴿۸﴾﴾ ''یہی وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ آگ ہے، اپنی اس کمائی کے سبب جو وہ کر رہے ہیں۔''

جس شخص نے اپنی پوری دُنیوی زندگی میں نہ اللہ کی طرف رجوع کیا اور نہ آخرت ہی کی کچھ فکر کی، ساری عمر 'بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست' جیسے نعرے کو اپنا ماٹو بنائے رکھا، حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی قیود سے بے نیاز ہو کر جھوٹی مسرتیں اور عارضی خوشیاں جہاں سے ملیں، جس قیمت پر ملیں حاصل کر لیں، تو ایسے شخص کا آخری ٹھکانہ آگ کے سوا بھلا اور کہاں ہو سکتا ہے!

آیت ۹ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یَھْدِیْھِمْ رَبُّھُمْ بِاِیْمَانِھِمْ ۚ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھِمُ الْاَنْھٰرُ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ﴿۹﴾﴾ ''یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے، ان کا رب ان کے ایمان کے باعث ان کو پہنچا دے گا نعمتوں والے باغات میں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔''

آیت ۱۰ ﴿دَعْوٰىھُمْ فِیْھَا سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ﴾ ''اس میں ان کا ترانہ ہو گا: اے اللہ تُو پاک ہے''

وہ لوگ جنت کے اندر بھی اللہ تعالیٰ کی تسبیح و مناجات کریں گے کہ اے ہمارے پروردگار، تُو ہر ضعف سے پاک ہے، ہر عیب اور ہر نقص سے مبرا ہے اور احتیاج کے ہر تصور سے ارفع و اعلیٰ ہے۔

﴿وَتَحِیَّتُھُمْ فِیْھَا سَلٰمٌ ۚ﴾ ''اور اس میں ان کی (آپس کی) دعا 'سلام' ہو گی۔''

اہلِ جنت آپس میں ایک دوسرے کو ملتے ہوئے السلام علیکم کے الفاظ کہیں گے، اس طرح وہاں ہر طرف سے سلام، سلام کی آوازیں آ رہیں ہوں گی۔ جیسے سورۃ الواقعہ میں فرمایا: ﴿لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْھَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِیْمًا ﴿۲۵﴾ اِلَّا قِیْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿۲۶﴾﴾ ''وہاں نہ بے ہودہ بات سنیں گے اور نہ گالی گلوچ۔ وہاں ان کا کلام سلام سلام ہو گا۔''

﴿وَاٰخِرُ دَعْوٰىھُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰﴾﴾ ''اور ان کی دعا اور مناجات کا اختتام (ہمیشہ ان کلمات پر) ہو گا کہ کُل حمد اور کُل تعریف اس اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔''

آیات ۱۱ تا ۲۰

وَلَوْ یُعَجِّلُ اللّٰہُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَھُمْ بِالْخَیْرِ لَقُضِیَ اِلَیْھِمْ اَجَلُھُمْ ؕ
فَنَذَرُ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِیْ طُغْیَانِھِمْ یَعْمَھُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَاِذَا مَسَّ
الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِہٖۤ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا کَشَفْنَا عَنْہُ ضُرَّہٗ مَرَّ

كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَآءَتْهُمْ
رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ
جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَاِذَا
تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ
هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا
مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾ قُلْ لَّوْ
شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ
قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ
بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ
وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا
يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَمَا
كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ
لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ
رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۲۰﴾

آیت ۱۱ ﴿وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ﴾ ''اور اگر اللہ جلدی کر دیتا لوگوں کے لیے شر جیسے کہ وہ جلدی چاہتے ہیں خیر''

انسان جلد باز ہے' وہ چاہتا ہے کہ اس کی کوششوں کے نتائج جلد از جلد اس کے سامنے آ جائیں۔ مگر اللہ تو بڑا حکیم ہے' اس نے ہر کام اور ہر واقعہ کے لیے اپنی مشیت اور حکمت کے مطابق وقت مقرر کر رکھا ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ کس کام میں خیر ہے اور کس میں خیر نہیں ہے۔ اگر اللہ انسان کی غلطیوں اور برائیوں کے بدلے اور نتائج بھی فوراً ہی ان کے سامنے رکھ دیا کرتا اور ان کے جرائم کی سزائیں بھی فوراً ہی ان کو دے دیا کرتا تو:

﴿لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ؕ﴾ ''ان کی اجل پوری ہو چکی ہوتی''

یعنی ان کی مہلتِ عمر کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی۔

﴿فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱﴾﴾ ''پھر ہم ان لوگوں کو چھوڑ دیں گے جو ہم سے ملاقات کے امیدوار نہیں' کہ وہ اپنی سرکشی میں اندھے ہو کر بڑھتے چلے جائیں۔''

پھر وہی بات دہرائی گئی ہے۔ اس انداز میں ایک شانِ استغناء ہے کہ اگر وہ ہمیں ملنے کے امیدوار نہیں تو ہماری نظرِ التفات کو بھی اُن سے کوئی دلچسپی نہیں۔

آیت ۱۲ ﴿وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ﴾ ''اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے پہلو کے بل (لیٹے ہوئے) یا بیٹھے ہوئے یا کھڑے ہوئے۔''

﴿فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ﴾ ''پھر جب ہم اس سے اس کی تکلیف کو دور کر دیتے ہیں تو وہ ایسے چل دیتا ہے جیسے اس نے ہمیں کبھی پکارا ہی نہ تھا کوئی تکلیف پہنچنے پر۔''

﴿كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲﴾﴾ ''ایسے ہی مزین کر دیا گیا ہے ان حد سے بڑھنے والوں کے لیے ان کے اعمال کو۔''

ان کے اندر اتنی ڈھٹائی پیدا ہو گئی ہے کہ ذرا تکلیف آ جائے تو گڑگڑا کر دعائیں مانگیں گے' ہر حال میں ہمیں پکاریں گے اور گریہ وزاری میں راتیں گزار دیں گے۔ لیکن جب وہ تکلیف رفع ہو جائے گی تو ایسے بھول جائیں گے گویا ہمیں جانتے ہی نہیں۔

آیت ۱۳ ﴿وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ﴾ ''اور ہم تم لوگوں سے پہلے بھی بہت سی نسلوں اور قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں' جب انہوں نے ظلم کی روش اختیار کی''

﴿وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ؕ﴾ ''اور ان کے پاس (بھی) آئے تھے ان کے رسول واضح تعلیمات لے کر' لیکن وہ نہیں تھے ایمان لانے والے۔''

﴿كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۳﴾﴾ ''اسی طرح ہم بدلہ دیا کرتے ہیں مجرم لوگوں کو۔''

آیت ۱۴ ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ

تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ ’’پھر ان کے بعد ہم نے تمہیں زمین میں جانشین بنا دیا‘ تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیا کرتے ہو!‘‘

یہاں ہر شخص انفرادی طور پر بھی اپنی محدود عمر میں امتحان دے رہا ہے اور قومیں اور اُمتیں بھی اپنے اپنے وقفۂ مہلت میں اس امتحان گاہ سے گزر رہی ہیں۔ علامہ اقبال کے بقول: ؎

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

آیت ۱۵ ﴿وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ﴾ ’’اور جب ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں ہماری روشن آیات تو کہتے ہیں وہ لوگ جو ہم سے ملاقات کے امیدوار نہیں ہیں کہ (اے محمدﷺ) اس کے علاوہ آپ کوئی اور قرآن پیش کریں یا اس میں کوئی ترمیم کریں۔‘‘

یہاں وہی الفاظ پھر دہرائے جا رہے ہیں‘ یعنی جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے وہ ہمارے کلام کو سنجیدگی سے سنتے ہی نہیں اور کبھی سن بھی لیتے ہیں تو استہزائیہ انداز میں جواب دیتے ہیں کہ یہ قرآن بہت سخت (rigid) ہے‘ اس کے احکام ہمارے لیے قابل قبول نہیں۔ اس میں کچھ مداہنت (compromise) کا انداز ہونا چاہیے‘ کچھ دو اور کچھ لو (give and take) کے اصول پر بات ہونی چاہیے۔ چنانچہ آپ (ﷺ) اس کتاب میں کچھ کمی بیشی کریں تو پھر اس کی کچھ باتیں ہم بھی مان لیں گے۔

﴿قُلْ مَا یَکُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ ۚ﴾ ’’(اے نبیﷺ!) کہہ دیجیے کہ میرے لیے ہرگز یہ ممکن نہیں کہ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کر لوں‘ میں تو پیروی کرتا ہوں اُسی کی جو میری طرف وحی کیا جا رہا ہے۔‘‘

میں تو خود وحی الٰہی کا پابند ہوں۔ میں اپنی طرف سے اس میں کوئی کمی بیشی‘ کوئی ترمیم و تنسیخ کرنے کا مجاز نہیں ہوں۔

﴿اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۵﴾﴾ ’’میں ڈرتا ہوں بڑے دن کے عذاب سے‘ اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں۔‘‘

آیت ۱۶ ﴿قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَیْکُمْ وَلَآ اَدْرٰىکُمْ بِهٖ ۡ﴾ ’’آپ (ان سے)

کہیے کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ میں یہ قرآن تمہیں پڑھ کر سناتا اور نہ وہ تمہیں اس سے واقف کرتا‘‘

﴿فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْکُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶﴾﴾ ’’میں تمہارے درمیان ایک عمر گزار چکا ہوں اس سے پہلے۔ تو کیا تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے!‘‘

میں پچھلے چالیس برس سے تمہارے درمیان زندگی بسر کر رہا ہوں۔ تم مجھے اچھی طرح سے جانتے ہو۔ تم جانتے ہو کہ میں شاعر نہیں ہوں‘ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کاہن یا جادوگر بھی نہیں ہوں‘ تمہیں یہ بھی علم ہے کہ مجھے ان چیزوں سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی اور میں نے ان چیزوں کو سیکھنے کے لیے کبھی مشق یا ریاضت بھی نہیں کی۔ تم اس حقیقت کو بھی خوب سمجھتے ہو کہ کوئی شخص ایک دن میں کبھی شاعر یا کاہن نہیں بن جاتا۔ ان تمام حقائق کا علم رکھنے کے باوجود بھی تم مجھے ایسے الزامات دیتے ہو‘ تو کیا تم لوگ تعصب کی بنا پر عقل سے بالکل ہی عاری ہو گئے ہو؟

آیت ۱۷ ﴿فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ کَذِبًا اَوْ کَذَّبَ بِاٰیٰتِهٖ ؕ﴾ ’’تو اُس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہو گا جس نے اللہ کی طرف جھوٹ بات منسوب کی یا جھٹلایا اُس کی آیات کو!‘‘

یعنی یہ قرآن جو میں تم لوگوں کو سنا رہا ہوں‘ اگر یہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے اور میں اسے اپنی طرف سے گھڑ کر پیش کر رہا ہوں تو مجھ سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں‘ اور اگر یہ واقعتاً اللہ کی آیات ہیں تو تم لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ جو شخص اللہ کی آیات کو جھٹلا دے‘ اُس سے بڑھ کر ظالم اور گنہگار کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اب اس معیارِ حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے تم میں سے ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنی سوچ اور اپنے عمل کا جائزہ لے اور دیکھے کہ وہ کون سی روش اختیار کر رہا ہے۔

﴿اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۷﴾﴾ ’’یقیناً مجرم لوگ فلاح نہیں پایا کرتے۔‘‘

آیت ۱۸ ﴿وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَضُرُّهُمْ وَلَا یَنْفَعُهُمْ وَیَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ﴾ ’’اور یہ لوگ پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی جو نہ انہیں کوئی نقصان پہنچا سکتی ہیں اور نہ نفع دے سکتی ہیں‘ اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارے سفارشی ہیں اللہ کے ہاں۔‘‘

اس سے مشرکین مکہ کا بنیادی عقیدہ ظاہر ہو رہا ہے۔ وہ لوگ مانتے تھے کہ اس کائنات کا خالق اور مالک اللہ ہے۔ وہ اپنے بتوں کو کائنات کا خالق و مالک نہیں بلکہ اللہ کے قرب کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ جن ہستیوں کے نام پر یہ بت بنائے گئے ہیں وہ ہستیاں اللہ کے

ہاں بہت مقرب اور محبوب ہونے کے باعث اس کے ہاں ہماری سفارش کریں گی۔

﴿قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ﴾ ''آپؐ کہیے کہ کیا تم اللہ کو بتانا چاہتے ہو وہ شے جو وہ نہیں جانتا' نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں؟''

کیا تم اللہ کو ایسی چیز کی خبر دینا چاہتے ہو جس کا اُس کو خود پتا نہیں؟ یہ وہی بات ہے جو آیۃ الکرسی کی تشریح کے ضمن میں بیان ہو چکی ہے کہ ایسی کسی شفاعت کا آخر جواز کیا ہوگا؟ اللہ تو غائب اور حاضر سب کچھ جاننے والا ہے: ﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ﴾۔ تو پھر آخر کوئی سفارشی اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر کیا کہے گا؟ کس بنیاد پر وہ کسی کی سفارش کرے گا؟ کیا وہ یہ کہے گا کہ اے اللہ! تو اس آدمی کو ٹھیک سے نہیں جانتا' میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں' یہ بہت اچھا اور نیک آدمی ہے! تو کیا وہ اللہ کو وہ کچھ بتانا چاہے گا (معاذ اللہ) جس کو وہ خود نہیں جانتا؟

﴿سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۸﴾﴾ ''وہ بہت پاک اور بلند ہے ان چیزوں سے جن کو وہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔''

آیت ۱۹ ﴿وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ﴾ ''اور نہیں تھے لوگ مگر ایک ہی اُمت' پھر (بعد میں) انہوں نے اختلاف کیا۔''

یہ مضمون سورۃ البقرۃ میں بھی گزر چکا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے انسانوں کی نسل چلی ہے' چنانچہ جس طرح تمام انسان نسلاً ایک تھے اسی طرح نظریاتی طور پر بھی وہ سب ایک ہی اُمت تھے۔ بنی نوعِ انسان کے مابین تمام نظریاتی اختلافات بعد کی پیداوار ہیں۔

﴿وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ﴾ ''اور اگر ایک بات تیرے رب کی طرف سے پہلے سے طے نہ پا چکی ہوتی''

اللہ تعالیٰ نے ہر فرد اور ہر قوم کے لیے ایک اجل مقرر فرما دی ہے۔ اسی طرح پوری کائنات کی اجل بھی طے شدہ ہے۔ اگر یہ سب کچھ طے نہ ہو چکا ہوتا:

﴿لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۹﴾﴾ ''تو فیصلہ کر دیا جاتا ان کے مابین ان تمام چیزوں میں جن میں یہ اختلاف کر رہے ہیں۔''

آیت ۲۰ ﴿وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ﴾ ''اور وہ کہتے ہیں کیوں نہ اتاری

گئی کوئی نشانی (معجزہ) اس (رسولؐ) پر اس کے رب کی طرف سے؟''

﴿فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۲۰﴾﴾ ''آپؐ کہہ دیجیے کہ غیب کا علم تو بس اللہ ہی کو ہے' پس انتظار کرو' میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں۔''

اپنی اس ضد اور ہٹ دھرمی کے بعد انتظار کرو کہ مشیت ایزدی سے کب' کیا شے ظہور میں آتی ہے۔

آیات ۲۱ تا ۲۴

وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا ؕ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ؕ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ﴿۲۱﴾ هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ۬ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۲۲﴾ فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۳﴾ اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ ۙ اَتٰىهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾

آیت ۲۱ ﴿وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا ؕ﴾ ''اور جب ہم لوگوں کو رحمت کا مزا چکھاتے ہیں اُس تکلیف کے بعد جو ان پر آ گئی تھی تو فوراً ہی وہ ہماری آیات کے بارے میں سازشیں کرنے لگتے ہیں۔''

پہلی اُمتوں میں بھی ایسا ہوتا رہا ہے اور حضور ﷺ کی بعثت کے بعد اہل مکہ پر بھی چھوٹی چھوٹی تکالیف آتی رہی ہیں جیسے روایات میں ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت کے بعد مکہ میں شدید نوعیت کا قحط پڑ گیا تھا۔ ایسے حالات میں مشرکینِ مکہ کچھ نرم پڑ جاتے تھے۔ حضور ﷺ کے پاس آ کر بیٹھتے بھی تھے اور آپ ﷺ کی باتیں بھی سنتے تھے۔ مگر جونہی تکلیف رفع ہو جاتی تو وہ پھر سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف سازشیں شروع کر دیتے۔

﴿قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ؕ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ ''آپؐ کہیے کہ اللہ اپنی تدبیروں میں کہیں زیادہ تیز ہے۔ یقیناً ہمارے فرشتے لکھ رہے ہیں جو کچھ بھی سازشیں تم لوگ کر رہے ہو۔''

آیت ۲۲ ﴿هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ﴾ ''وہی ہے جو تمہیں سیر کراتا ہے خشکی اور سمندر میں۔''

یعنی اللہ تعالیٰ نے مختلف قوانین طبعی کے تحت مختلف چیزوں کو سواریوں کے طور پر انسانوں کے لیے مسخر کر دیا ہے۔

﴿حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا﴾ ''یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ چل رہی ہوتی ہیں انہیں (سواروں کو) لے کر خوشگوار (موافق) ہوا کے ساتھ اور وہ بہت خوش ہوتے ہیں''

﴿جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ﴾ ''کہ اچانک تیز ہوا کا جھکڑ چل پڑتا ہے اور ہر طرف سے موجیں اُن کی طرف بڑھنے لگتی ہیں اور وہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ وہ ان (لہروں) میں گھیر لیے گئے ہیں''

ہر طرف سے پہاڑ جیسی لہروں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ بس اب وہ لہروں میں گھر گئے ہیں اور اُن کا آخری وقت آن پہنچا ہے۔

﴿دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۲۲﴾﴾ ''(اُس وقت) وہ پکارتے ہیں اللہ کو اس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے کہ (اے اللہ!) اگر تو نے ہمیں اس مصیبت سے نجات دے دی تو ہم لازماً ہو جائیں گے بہت شکر کرنے والوں میں سے۔''

ایسے مشکل وقت میں انہیں صرف اللہ ہی یاد آتا ہے' کسی دیوی یا دیوتا کا خیال نہیں آتا۔ اس سلسلے میں ابوجہل کے بیٹے عکرمہ کے بارے میں بہت اہم واقعہ تاریخ میں ملتا ہے کہ فتح مکہ کے بعد وہ حجاز سے فرار ہو کر حبشہ جانے کے لیے بعض دوسرے لوگوں کے ساتھ کشتی میں سوار تھے کہ کشتی اچانک طوفان میں گھر گئی۔ کشتی میں تمام لوگ مشرکین تھے' لیکن اس مصیبت کی گھڑی میں کسی کو بھی لات' منات' عزیٰ اور ہبل یاد نہ آئے اور انہوں نے مدد کے لیے پکارا تو اللہ کو پکارا۔ اسی لمحے عکرمہ کو اس حقیقت کے انکشاف نے چونکا دیا کہ یہی تو وہ پیغام ہے جو محمد (ﷺ) ہمیں دے رہے ہیں۔ چنانچہ وہ واپس لوٹ آئے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے اور شرفِ صحابیت سے مشرف ہوئے۔ اس کے بعد یہی عکرمہ رضی اللہ عنہ اسلام کے زبردست مجاہد ثابت ہوئے' اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں منکرینِ زکوٰۃ اور مرتدین کے خلاف جہاد میں انہوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔

دراصل اللہ کی معرفت انسان کی فطرت کے اندر سمو دی گئی ہے۔ بعض اوقات باطل خیالات و نظریات کا ملمع اس معرفت کی قبولیت میں آڑے آ جاتا ہے' لیکن جب یہ ملمع اترنے کا کوئی سبب پیدا ہوتا ہے تو اندر سے انسانی فطرت اپنی اصلی حالت میں نمایاں ہو جاتی ہے جو حق کو پہچاننے میں لمحہ بھر کو دیر نہیں کرتی۔

آیت ۲۳ ﴿فَلَمَّاۤ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ﴾ ''پھر جب وہ انہیں نجات دے دیتا ہے تو فوراً ہی بغاوت کرنے لگتے ہیں زمین میں ناحق۔''

جونہی خطرے کی گھڑی ٹل جاتی ہے تو پھر انہیں دیویاں' دیوتا یاد آ جاتے ہیں اور پھر سے اللہ سے سرکشی شروع ہو جاتی ہے۔

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۳﴾﴾ ''اے لوگو! تمہاری اس بغاوت کا وبال تمہاری اپنی ہی جانوں پر آئے گا' یہ دنیا کی زندگی کا ساز و سامان ہے (اسے برت لو)' پھر ہماری ہی طرف تم سب کو لوٹنا ہے' پھر ہم تم کو بتلا دیں گے جو کچھ تم کرتے رہے تھے۔''

آیت ۲۴ ﴿اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ؕ﴾ ''اس دنیا کی زندگی کی مثال تو ایسے ہے جیسے پانی' جو ہم برساتے ہیں آسمان سے' پھر اس کے ساتھ نکل آتا ہے زمین کا سبزہ' جس میں

سے کھاتے ہیں انسان بھی اور چوپائے بھی۔''

پانی کے بغیر زمین بنجر اور مردہ ہوتی ہے' اس میں گھاس' ہریالی وغیرہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ جونہی بارش ہوتی ہے اس میں سے طرح طرح کا سبزہ نکل آتا ہے' فصلیں لہلہانے لگتی ہیں' باغات ہرے بھرے ہو جاتے ہیں۔

﴿حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ﴾ ''یہاں تک کہ جب زمین اچھی طرح اپنا سنگھار کر لیتی ہے اور خوب مزین ہو جاتی ہے''

یہاں پر بہت خوبصورت الفاظ میں زمین کی شادابی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ چھوٹے بڑے نباتات کی نمائش' سبز پوش خوبصورتی کی بہار اور رنگا رنگ پھولوں کی زیبائش کے ساتھ جب زمین پوری طرح اپنا بناؤ سنگھار کر لیتی ہے' فصلیں اپنے جوبن پر آ جاتی ہیں اور باغات پھلوں سے لد جاتے ہیں:

﴿وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ﴾ ''اور اس کے مالک سمجھتے ہیں کہ اب ہم اس پر قادر ہیں''

زمین والے لہلہاتی فصلوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بس اب چند دن کی بات ہے' ہم اپنی فصلوں کی کٹائی کریں گے' پھلوں کو پیڑوں سے اتاریں گے اور ہماری زمین کی یہ پیداوار ہماری خوشحالی کا ذریعہ بنے گی۔ مگر ہوتا کیا ہے:

﴿اَتٰىهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ﴾

''تو اچانک ہمارا ایک حکم آتا ہے اس (کھیت یا باغ) پر رات کے وقت یا دن کے وقت اور ہم اسے کر دیتے ہیں کٹا ہوا جیسے کہ کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔''

اللہ کے حکم سے ایسی آفت آئی کہ دیکھتے ہی دیکھتے ساری فصل تباہ ہو گئی' باغ اُجڑ گیا' ساری محنت اکارت گئی' تمام سرمایہ ڈوب گیا۔ دنیا کی بے ثباتی کی اس مثال سے واضح کیا گیا ہے کہ یہی معاملہ انسان کا ہے۔ انسان اس دنیا میں دن رات محنت و مشقت اور بھاگ دوڑ کرتا ہے۔ اگر انسان کی یہ ساری محنت اور تگ و دو اللہ کی مرضی کے دائرے میں نہیں ہے' اس سے شریعت کے تقاضے پورے نہیں ہو رہے ہیں تو یہ سب کچھ اسی دنیا کی حد تک ہی ہے' آخرت میں ان میں سے کچھ بھی اس کے ہاتھ نہیں آئے گا۔ موت کے بعد جب اس کی آنکھ کھلے گی تو وہ دیکھے گا کہ اس کی زندگی بھر کی ساری محنت اکارت چلی گئی: ع ''جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا!''

﴿كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢٤﴾﴾ ''اسی طرح ہم اپنی آیات کی تفصیل کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔''

آیات ۲۵ تا ۳۰

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٢٥﴾
لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ؕ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ؕ
اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٦﴾ وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ
جَزَآءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ
كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ
هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٧﴾ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا
مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا
تَعْبُدُوْنَ ﴿٢٨﴾ فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ
لَغٰفِلِيْنَ ﴿٢٩﴾ هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ
الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٣٠﴾

آیت ۲۵ ﴿وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٢٥﴾﴾ ''اور اللہ بلا رہا ہے تمہیں سلامتی کے گھر کی طرف' اور وہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف۔''

آیت ۲۶ ﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ؕ﴾ ''جو لوگ احسان کی روش اختیار کریں گے' ان کے لیے حسنیٰ (بھلائی) ہے اور مزید بھی۔''

انہیں نیکی کا بدلہ بھی بہت اچھا ملے گا اور مزید برآں انہیں انعامات سے بھی نوازا جائے گا۔

﴿وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ؕ﴾ ''اور نہیں مسلط ہو گی ان کے چہروں پر سیاہی اور نہ ذلت۔''

﴿اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٦﴾﴾ ''یہی ہوں گے جنت

والے اور رہیں گے اس میں ہمیشہ ہمیش۔‘‘

آیت ۲۷ ﴿وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا﴾ ’’اور جن لوگوں نے برائیاں کمائیں تو (ان کے لیے) بدلہ ہوگا برائی کا ویسا ہی‘‘

یعنی جیسی ان کی برائی ہوگی ویسا ہی اس کا بدلہ ہوگا‘ اس میں کچھ اضافہ نہیں کیا جائے گا۔

﴿وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۭ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ﴾ ’’اور ان پر ذلت چھا جائے گی۔ نہیں ہوگا انہیں اللہ (کی پکڑ) سے کوئی بھی بچانے والا۔‘‘

﴿كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ۭ﴾ ’’گویا ان کے چہروں پر تاریک رات کے ٹکڑے اُڑھا دیے گئے ہوں۔‘‘

﴿اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ ’’یہی لوگ ہوں گے جہنمی‘ یہ رہیں گے اسی میں ہمیشہ ہمیش۔‘‘

آیت ۲۸ ﴿وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَاۗؤُكُمْ ۚ﴾ ’’اور جس دن ہم ان سب کو جمع کریں گے‘ پھر ہم کہیں گے ان لوگوں سے جنہوں نے شرک کیا تھا کہ کھڑے رہو اپنی جگہ پر تم بھی اور تمہارے شریک بھی۔‘‘

یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ لات‘ منات‘ عزیٰ وغیرہ کی بات نہیں ہو رہی جن کے بارے میں کسی کو پتا نہیں کہ ان کی اصل کیا تھی‘ بلکہ یہ اولیاء اللہ‘ نیک اور برگزیدہ بندوں کی بات ہو رہی ہے جن کے ناموں پر مورتیاں اور بت بنا کر ان کی پوجا کی گئی ہوگی۔ جیسے قومِ نوحؑ نے ودّ‘ سواع اور یغوث وغیرہ اولیاء اللہ کی پوجا کے لیے ان کے بت بنا رکھے تھے (اس بارے میں تفصیل سورۃ نوح میں آئے گی)۔ ہمارے ہاں صرف یہ فرق ہے کہ بت نہیں بنائے جاتے‘ قبریں پوجی جاتی ہیں۔

اس سلسلے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کے خطاب کی ایک جھلک ہم سورۃ المائدۃ کے آخری رکوع میں دیکھ آئے ہیں۔ اس لیے یہاں یہ خیال نہیں آنا چاہیے کہ ایسے بلند مرتبہ لوگوں کو اس طرح کا حکم کیونکر دیا جائے گا کہ ٹھہرے رہو اپنی جگہ پر تم بھی اور تمہارے شریک بھی! بہرحال اللہ تعالیٰ کی شان بہت بلند ہے‘ جبکہ ایک بندہ تو بندہ ہی ہے‘ چاہے جتنی بھی ترقی کر لے: اَلرَّبُّ رَبٌّ وَاِنْ تَنَزَّلَ ۔ وَالْعَبْدُ عَبْدٌ وَاِنْ تَرَقّٰی!

﴿فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَاۗؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ﴾ ’’تو ہم ان کے درمیان رشتے منقطع کر دیں گے اور کہیں گے ان کے شریک (ان سے) کہ تم ہم کو تو نہیں پوجا کرتے تھے۔‘‘

وہ نیک لوگ جنہیں اللہ کا شریک بنایا گیا وہ اس شرک سے بری ہیں‘ کیونکہ انہوں نے تو اپنی زندگیاں اللہ کی اطاعت میں گزاری تھیں۔ جیسے البقرۃ:۱۳۴ میں بہت واضح انداز میں فرمایا گیا ہے: ﴿تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ﴾ ’’وہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی‘ ان کے لیے ہے جو انہوں نے کمایا اور تمہارے لیے ہے جو تم نے کمایا‘‘۔ اگر کوئی شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو پکارتا ہے یا کسی مزار پر جا کر مشرکانہ حرکتیں کرتا ہے تو اس کا وبال صاحبِ مزار پر قطعاً نہیں ہوگا۔ ان پر تو اُلٹا ظلم ہو رہا ہے کہ انہیں اللہ کے ساتھ شرک میں ملوث کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اللہ کے وہ نیک بندے اللہ کے ہاں ان شرک کرنے والوں کے خلاف استغاثہ کریں گے‘ کہ وہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر انہیں پکارتے تھے اور ان کے ناموں کی دہائیاں دیتے تھے۔ وہ ان شرک کرنے والوں سے کہیں گے:

آیت ۲۹ ﴿فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ﴾ ’’پس اللہ کافی ہے (بطور) گواہ ہمارے اور تمہارے مابین‘ ہم تو تمہاری اس عبادت سے بالکل بے خبر تھے۔‘‘

یعنی اگر تم ہماری پوجا کرتے بھی رہے ہو تو ہمیں بالکل اس کی خبر نہیں‘ ہم پر اس کا کچھ الزام نہیں۔ ہم تمہارے اس گھناؤنے فعل سے بالکل بری ہیں۔

آیت ۳۰ ﴿هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ﴾ ’’اُس وقت ہر جان کو پتا چل جائے گا کہ اُس نے کیا آگے بھیجا تھا‘ اور وہ لوٹا دیے جائیں گے اللہ کی طرف جو ان کا برحق مولیٰ ہے‘ اور گم ہو جائے گا ان سے وہ سب کچھ جو وہ افترا کرتے تھے۔‘‘

یعنی اس دن جب شفاعت کی امیدوں کے سارے سہارے ہوا ہو جائیں گے تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ جائیں گے۔ تب انہیں معلوم ہوگا کہ ع ’’خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا‘ جو سنا افسانہ تھا!‘‘

❁❁❁

ایمان بالقدر

(تقدیر پر ایمان)

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے ۱۰/اور ۱۷/اگست ۲۰۰۷ء کے خطاباتِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۪﴿۲﴾ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۪﴿۳﴾ (الاعلیٰ)

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِۨ ۝ (الحدید)

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (التوبۃ)

وَمَا تَشَاۗءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (التکویر)

عَنْ اَبِيْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ ﷺ قَالَ : حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَهُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ :

((اِنَّ اَحَدَكُمْ يُجْمَعُ خَلْقُهٗ فِيْ بَطْنِ اُمِّهٖ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا نُطْفَةً ثُمَّ يَكُوْنُ عَلَقَةً مِّثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ يَكُوْنُ مُضْغَةً مِّثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ يُرْسَلُ اِلَيْهِ الْمَلَكُ فَيَنْفُخُ فِيْهِ الرُّوْحَ وَيُؤْمَرُ بِاَرْبَعِ كَلِمَاتٍ ، بِكَتْبِ رِزْقِهٖ ، وَاَجَلِهٖ ، وَعَمَلِهٖ ، وَشَقِيٌّ اَوْ سَعِيْدٌ ، فَوَ اللّٰهِ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ غَيْرُهٗ ! اِنَّ اَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ

حَتّٰى مَا يَكُوْنُ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهَا اِلَّا ذِرَاعٌ ، فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ، فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ ، فَيَدْخُلُهَا ، وَاِنَّ اَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ، حَتّٰى مَا يَكُوْنُ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهَا اِلَّا ذِرَاعٌ ، فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ، فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ، فَيَدْخُلُهَا)) (۱)

''ابوعبدالرحمٰن' سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے ہم سے بیان فرمایا اور وہ صادق و مصدوق ہیں:

''تم میں سے ہر ایک کی تخلیق یوں ہوتی ہے کہ وہ اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس یوم تک نطفہ کی صورت میں' اس کے بعد اتنے ہی روز تک علقہ کی صورت میں' اور اس کے بعد اتنے ہی روز گوشت کے لوتھڑے کی صورت میں رہتا ہے۔ بعد ازاں اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے' پس وہ اس میں روح پھونکتا ہے اور اسے (یعنی فرشتہ کو) اس پیدا ہونے والے کے متعلق چار باتیں' رزق' عمر' عمل اور اس کے شقی (بدبخت) یا سعید (نیک بخت) ہونے کے متعلق' لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ پس قسم ہے اُس اللہ کی جس کے علاوہ کوئی سچا معبود نہیں! تم میں سے کوئی آدمی اہل جنت کے سے اعمال کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اُس کے اور جنت کے مابین صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ باقی رہ جاتا ہے تو اُس پر وہ سابقہ تحریر غالب آجاتی ہے اور وہ شخص اہلِ جہنم کا سا عمل کر کے جہنم میں چلا جاتا ہے۔ اور ایک شخص اہلِ جہنم کے سے عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اُس کے اور جہنم کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ باقی رہ جاتا ہے تو وہ سابقہ تحریر اُس پر غالب آجاتی ہے اور وہ شخص اہلِ جنت کا سا عمل کر کے جنت میں چلا جاتا ہے۔''

معزز سامعین کرام!

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب ''اربعین'' کی چوتھی حدیث ہمارے زیر مطالعہ ہے۔ اس حدیث کے ابتدائی حصے پر گفتگو پچھلے خطاب میں ہو چکی ہے جس میں انسان کے تخلیقی مراحل کا تذکرہ ہے۔ اس کے ضمن میں ''حقیقتِ انسان'' جیسے اہم موضوع پر

(۱) صحیح البخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب خلق آدم وذریتہ۔ وصحیح مسلم' کتاب القدر' باب کیفیۃ خلق الآدمی فی بطن امہ و کتابۃ رزقہ وأجلہ۔

گفتگو کرتے ہوئے میں نے یہ واضح کیا تھا کہ اس دور میں سب سے بڑا مغالطہ یہ ہوا ہے کہ ''فَیَنْفُخُ فِیْهِ الرُّوْحَ'' میں روح کے معنی ''جان'' سمجھ لیے گئے ہیں۔ یہ اس دَور کی بہت بڑی غلطی بلکہ محجوبیت ہے' بایں طور کہ جب عقل پر یہ پردہ پڑا ہو تو قرآن مجید کے بہت سے لطیف حقائق سمجھ میں آ ہی نہیں سکتے۔ اس حوالے سے میں نے عرض کیا تھا کہ روح ایک مستقل علیحدہ تشخّص کی حامل شے ہے' وہ جان نہیں ہے' اس لیے کہ جان کا تعلق تو جسم اور عالمِ مادی سے ہے اور یہ جان تو حیوانات میں بھی ہے۔ بلکہ آج ہمیں معلوم ہے کہ عالَمِ نباتات بھی زندگی کی ایک شکل ہے۔ گھاس کا ایک تنکا بھی جب تک اپنی جڑ کے ساتھ جڑا ہوا ہے زندہ ہے۔ اس لیے کہ اس کے اندر نشوونما اور افزائش (growth) ہے' جو زندگی کی علامت ہے۔

اس ضمن میں' میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ کُل کی کُل ارواحِ انسانیہ' حضرت آدم علیہ السلام کی روح سے قیامت تک پیدا ہونے والے آخری انسان کی روح سمیت' اس عالمِ مادی کی تخلیق سے بہت پہلے پیدا کی گئی تھیں۔ ان ارواحِ انسانیہ اور ملائکہ کا مادۂ تخلیق ایک ہی ہے اور وہ ہے ''نور''۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث نبویؐ کے الفاظ ہیں: ((خَلَقَ اللّٰهُ الْمَلَائِكَةَ مِنَ النُّوْرِ)) ''اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو نور سے پیدا کیا''۔ اس ضمن میں ایک مشہور حدیث کا تذکرہ بھی آیا تھا جس کو سند کے اعتبار سے محدثین تو قبول نہیں کرتے لیکن اکثر مفسّرین اور متکلّمین نے اس کو حدیث تسلیم کیا ہے: ((اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ)) ''پہلی شے اللہ نے جو تخلیق کی وہ میرا نور تھا''۔ یہاں نُوْرِیْ سے مراد رُوْحِیْ ہے' یعنی روحِ محمدیؐ وہ نورِ محمدیؐ ہے جو بگ بینگ سے بہت پہلے وجود میں آ چکا تھا۔ بگ بینگ سے تو مادی کائنات (material universe) کا آغاز ہوا' جبکہ ارواحِ انسانیہ اور فرشتوں کا تعلق عالمِ مادی اور عالمِ خلق سے نہیں' بلکہ عالمِ امر سے ہے۔

اس اعتبار سے میں نے سورۃ الاعراف کی آیت ۱۷۲ میں مذکور ''عہد الست'' کا حوالہ بھی دیا تھا: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰی ۛ شَهِدْنَا ۛ﴾ ''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں' ہم اس پر گواہ ہیں''۔ اس آیت میں کس قدر اہتمام کے

ساتھ فرمایا گیا ہے کہ ہم سب نے اس دنیا میں آنے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا۔ اور عہد لینے کا یہ واقعہ عالم ارواح میں وقوع پذیر ہوا تھا جبکہ انسانی جسم ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ اب اگر یہی معلوم نہ ہو کہ انسانی ارواح سب کی سب پہلے پیدا کر دی گئی تھیں تو یہ بات کیسے سمجھ میں آئے گی کہ کس سے اور کس وقت یہ عہد لیا گیا تھا؟ اسی حوالے سے سورۃ الکہف میں بھی ایک بڑا پیارا جملہ آیا ہے۔ روزِ قیامت جب پوری نوعِ انسانی اللہ وحدہٗ لاشریک کے سامنے پیش ہوگی' اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ﴿لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ (آیت ۴۸) ''تحقیق تم آ گئے ہو ناہمارے پاس جیسے کہ ہم نے تمہیں پیدا کیا تھا پہلی بار''۔ اب اگر روح کے علیحدہ تشخّص اور عالمِ اَرواح میں ان ارواح کی تخلیق کو نہ مانا جائے تو اس آیت میں ''كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ'' کی تشبیہ بے معنی ہو جائے گی۔

حدیث کی تشریح

زیر درس حدیث کے ابتدائی حصہ پر تفصیلی گفتگو چونکہ گزشتہ نشست میں ہو چکی ہے' لہٰذا اب ہم اس حدیث کے اگلے حصے کا مطالعہ کرتے ہیں جس کا تعلق ایمان بالقدر یعنی تقدیر پر ایمان سے ہے جو فلسفہ و حکمت دین کے مشکل ترین موضوعات میں سے ایک ہے۔

حدیث کے ابتدائی حصے کے آخری الفاظ یہ تھے: ((ثُمَّ يُرْسَلُ اِلَيْهِ الْمَلَكُ فَيَنْفُخُ فِيْهِ الرُّوْحَ)) ''پھر اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے' پس وہ اس میں روح پھونک دیتا ہے''۔ آگے فرمایا: ((وَيُؤْمَرُ بِاَرْبَعِ كَلِمَاتٍ)) ''اور اس (فرشتے) کو حکم ملتا ہے چار باتیں لکھنے کا'' ((بِكَتْبِ رِزْقِهٖ' وَاَجَلِهٖ' وَعَمَلِهٖ' وَشَقِيٌّ اَوْ سَعِيْدٌ)) ''اُس کے رزق' اُس کی عمر' اُس کے اعمال اور اُس کے بدنصیب یا خوش نصیب ہونے کے متعلق لکھنے کا''۔ ((فَوَ اللّٰهِ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ غَيْرُهٗ!)) ''تو قسم ہے اس اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے'' ((اِنَّ اَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ حَتّٰى مَا يَكُوْنُ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهَا اِلَّا ذِرَاعٌ)) ''تم میں سے کوئی شخص جنت والوں کے سے اعمال کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اُس کے اور جنت کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے''۔ ((فَيَسْبِقُ

عَلَيْهِ الْكِتَابُ)) تو اس پر نوشتہ تقدیر غالب آ جاتا ہے''۔ ((فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ فَيَدْخُلُهَا)) ''پس وہ جہنمیوں کے سے عمل کرنے لگتا ہے اور اس میں داخل ہو جاتا ہے''۔ ((وَاِنَّ اَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ حَتّٰى مَا يَكُوْنُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا اِلَّا ذِرَاعٌ)) ''اور (کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ) تم میں سے کوئی جہنمیوں کے سے عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اُس کے اور جہنم کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے''۔ ((فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ)) ''پھر اس پر نوشتہ تقدیر غالب آ جاتا ہے''۔ ((فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَيَدْخُلُهَا)) ''پھر وہ اہل جنت کے سے عمل کرنے لگتا ہے اور اس میں داخل ہو جاتا ہے۔''

اس حدیث کا جو متن ابھی ہم نے پڑھا ہے' یہ صحیح بخاری سے ہے۔ یہی حدیث ایک دوسری سند سے متفق علیہ بھی ہے' یعنی امام بخاری اور امام مسلم دونوں کا اس پر اتفاق ہے — قبل ازیں ہم ''حدیث جبریل'' کا مطالعہ کر چکے ہیں' جس کے کئی متن ہیں اور ہم نے جو متن اس ''اربعین نووی'' کے حوالے سے پڑھا وہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس کے علاوہ حدیث جبریل حضرت ابو ہریرہ' حضرت ابن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔ ان روایات میں ترتیب کا ایک فرق بھی ہم نے دیکھا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کا پہلا سوال اسلام اور دوسرا سوال ایمان کے بارے میں ہے' لیکن ایک دوسری روایت میں ترتیب الٹی ہے کہ پہلا سوال ایمان اور دوسرا سوال اسلام کے بارے میں ہے۔ اس حوالے سے میں نے آپ کو ابتدا میں بتا دیا تھا کہ احادیث میں اتنا تھوڑا سا فرق ہو جانا کوئی بعید نہیں ہے۔ اس لیے کہ احادیث قرآن مجید کی طرح لفظاً محفوظ نہیں ہیں' البتہ معناً محفوظ ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اس میں انسان کی صلاحیت کو دخل ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ میں جو بات ابھی کہہ رہا ہوں' تھوڑی دیر بعد اگر آپ اپنے نوٹس کا آپس میں موازنہ کریں تو آپ کے مابین اختلاف پایا جائے گا۔ بات بنیادی طور پر سب کی سمجھ میں آ گئی ہو گی' لیکن جب آپ اس کی تعبیر کریں گے تو فرق ہو جائے گا۔ اس حد تک احادیث میں بھی فرق ہو

جانا کوئی بعید نہیں ہے اور نہ ہی یہ ہمارے لیے کوئی تشویش کا باعث ہے۔ چنانچہ زیر مطالعہ حدیث کے اور بھی متن ہیں جنہیں ہم بعد میں دیکھیں گے۔ پہلے اس اصل مسئلہ کو سمجھ لیا جائے کہ ایمان بالقدر آخر ہے کیا!

'ایمان بالقدر' ایک مشکل مسئلہ

جیسا کہ میں نے عرض کیا' یہ مشکل ترین مسائل میں سے ہے۔ اس حوالے سے تین باتیں نوٹ کر لیجیے: (۱) یہ تقدیر کا مسئلہ سمجھ میں تو آ سکتا ہے' لیکن (۲) بیان میں نہیں آ سکتا۔ اور (۳) اگر اس پر بحث ہو جائے تو یہ الجھ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ مسئلہ سمجھ میں ہی نہ آئے تو پھر ایمان بالقدر ہمارے ایمانیات میں شامل نہیں ہونا چاہیے' اس لیے کہ یہ تو تکلیف مالا یطاق ہو جائے گی کہ جس بات کو سمجھنے کی ہمارے اندر استطاعت نہیں ہے' اس کو ماننے کا ہمیں حکم دیا جا رہا ہے — ایک ہے سمجھ میں آنا اور ایک ہے کسی چیز کی تفصیل' جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی تفاصیل۔ اللہ کی ذات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے' اس لیے اس کے بارے میں تو ہمیں سوچنے سے بھی روک دیا گیا ہے' جبکہ اللہ کی صفات ہماری سمجھ میں آتی ہیں' اسی لیے کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور اللہ تعالیٰ کی آیات پر غور کرو' لیکن ذاتِ خداوندی پر کبھی غور نہ کرنا' اس لیے کہ اس سے فتنوں میں مبتلا ہو جانے کا خدشہ ہے۔

ذاتِ باری تعالیٰ کے ضمن میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ حضرت مجذوبؒ کا ایک بڑا خوبصورت شعر ہے:

تُو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا بس جان گیا میں تیری پہچان یہی ہے!

یعنی اللہ تعالیٰ دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا۔ اللہ کی ذات کو کون سمجھے گا؟ اگر کسی نے ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں عقل کے گھوڑے دوڑانے شروع کر دیے تو گمراہی ہی گمراہی ہے۔ آپ اپنے تصور سے کوئی خدا بنا لو گے' حالانکہ وہ خدا تو نہیں ہے آپ کی قوتِ تصور کی تخلیق ہے۔ اس طرح اگر آپ اپنے بنائے ہوئے اس نقشے کو پوج رہے ہیں تو آپ اللہ کو نہیں' کسی اور کو پوج رہے ہیں۔

’ایمان بالقدر‘ ایمان کا جزوِ لازم ہے

سب سے پہلے دیکھتے ہیں کہ ایمان کیا ہے۔ حدیث جبریل میں مَا الْاِیْمَانُ کے جواب میں یہ الفاظ آئے ہیں: ((اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰہِ‘ وَمَلَآئِکَتِہٖ‘ وَکُتُبِہٖ‘ وَرُسُلِہٖ‘ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ‘ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ)) ’’(ایمان یہ ہے) کہ تو ایمان رکھے اللہ پر‘ اس کے فرشتوں پر‘ اس کی کتابوں پر‘ اس کے رسولوں پر‘ آخرت کے دن پر اور اچھی اور بری تقدیر پر‘‘۔ لہٰذا تقدیر کے خیر و شر پر ایمان لانا ایمان کا جزوِ لازم ہے اور اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اسے سمجھ میں آنا چاہیے‘ لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ جیسے ہم پل صراط کے بارے میں کہتے ہیں کہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے ایسا ہی ایمان بالقدر کا معاملہ ہے کہ ع ’’ہشدار کہ رہ بر دم تیغ است قدم را!‘‘ یعنی ہوشیار ہو جاؤ کہ اس وقت تمہارا راستہ تلوار کی دھار کے اوپر سے ہے۔ ذرا بھی بے احتیاطی کی تو یہ تلوار کی دھار تمہیں کاٹ کر رکھ دے گی۔ اس اعتبار سے جب ہم بیان کی کوشش کرتے ہیں تو اِدھر اُدھر پھسل جانے کا امکان ہوتا ہے۔ خاص طور پر اگر ہم اس معاملے میں بحث میں پڑ جائیں تو پھر یہ بہت بڑے فتنے کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔

تقدیر پر بحث و مباحثہ کی ممانعت

اس حوالے سے ایک حدیث ملاحظہ ہو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے‘ وہ فرماتے ہیں: خَرَجَ عَلَیْنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ وَنَحْنُ نَتَنَازَعُ فِی الْقَدْرِ ’’ایک روز رسول اللہ ﷺ اپنے حجرے سے برآمد ہوئے اور اس وقت ہم تقدیر کے بارے میں جھگڑ رہے تھے‘‘۔ یعنی اس وقت ہم تقدیر کے معاملے پر بحث و مباحثہ میں تھے۔ فَغَضِبَ حَتّٰی احْمَرَّ وَجْھُہٗ ’’تو آپؐ غصہ میں آ گئے (اور غصہ بھی اتنا شدید تھا کہ) آپؐ کا چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا‘‘ کَاَنَّمَا فُقِئَ فِیْ وَجْنَتَیْہِ الرُّمَّانُ ’’(ایسے لگ رہا تھا) جیسے آپ کے گالوں پر سرخ انار کا رس ٹپکا دیا گیا ہے‘‘۔ یعنی غصہ کی وجہ سے آپؐ کے گالوں پر اتنی سرخی آ گئی تھی۔ فَقَالَ: ((اَبِھٰذَا اُمِرْتُمْ)) ’’پس آپؐ نے فرمایا: ’’کیا تمہیں اس بات کا حکم دیا گیا ہے؟ (کہ تم تقدیر کے بارے میں بحث کرو)‘‘ ((اَمْ بِھٰذَا اُرْسِلْتُ

اِلَیْکُمْ)) ’’یا کیا میں اس کام کے لیے تمہاری طرف بھیجا گیا ہوں؟‘‘ ((اِنَّمَا ھَلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ حِیْنَ تَنَازَعُوْا فِیْ ھٰذَا الْاَمْرِ)) ’’جان لو کہ تم سے پہلی اُمتیں ہلاک ہوئیں اس بات پر کہ انہوں نے اس مسئلے پر بحث و مباحثہ کیا‘‘۔ ((عَزَمْتُ عَلَیْکُمْ اَنْ لَّا تَنَازَعُوْا فِیْہِ)) (۱) ’’میں تم پر لازم کرتا ہوں کہ اس کے بارے میں آپس میں بحث و مباحثہ مت کرو‘‘۔ اب آپ میرے وہ تین جملے ذہن میں لائیے جو میں نے کچھ دیر پہلے کہے تھے کہ ایمان بالقدر جب ایمانیات میں داخل ہے تو یہ سمجھ میں تو آ سکتا ہے لیکن بیان میں آنا مشکل ہے‘ اور اگر اس پر بحث و مباحثہ ہو جائے تو پھر یہ ایک بڑا فتنہ ہے۔

اس اعتبار سے واقعہ یہ ہے کہ بات کو سمجھنے کے لیے اس معاملے میں تھوڑی سی گفتگو تو ہم کریں گے۔ دعا ہے کہ مجھے بھی بیان میں اللہ عزوجل کی طرف سے توفیق میسر آ جائے اور کوئی لفظ اِدھر سے اُدھر نہ ہو جائے اور بات بالکل متوازن سامنے آ جائے اور آپ کو بھی اس میں انشراحِ صدر اور انشراحِ ذہن حاصل ہو جائے۔

لفظ ’’تقدیر‘‘ کی تفہیم

میں نے ابتدا میں جو آیات پڑھیں ان میں اوّل سورۃ الاعلیٰ کی ابتدائی آیات ہیں: ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلَی ۝۱﴾ ’’تسبیح کرو اپنے اُس ربّ کے نام کی جو بلند و بالا ہے‘‘۔ ﴿الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝۲﴾ ’’جس نے پیدا کیا اور پھر نوک پلک سنواری‘‘۔ تخلیق اور تسویہ دو الگ الگ مراحل ہیں‘ جس کو آپ اس مثال سے آسانی سے سمجھ سکیں گے کہ کسی عمارت کا ڈھانچہ (structure) ’’تخلیق‘‘ ہے اور اس کی تزئین و آرائش (finishing) ’’تسویہ‘‘ ہے۔ ﴿وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی ۝۳﴾ ’’اور وہ کہ جس نے پہلے تقدیر معین کی پھر ہدایت دی‘‘۔ یہ آیت ہمارے آج کے موضوع ’’ایمان بالقدر‘‘ کے حوالے سے بہت اہم ہے۔ سب سے پہلے اس لفظ ’’قَدَّرَ‘‘ کو سمجھئے۔ قدر سے ایک لفظ ’’قدرت‘‘ بنتا ہے جس کے معنی اختیار اور طاقت کے ہیں۔ ’’قدر‘‘ کے لفظی معنی ہیں: کسی شے کی قدر و قیمت۔ جب یہ لفظ بطور فعل آئے گا تو اس کے معنی ہوں گے: کسی

(۱) سنن الترمذی‘ ابواب القدر‘ باب ما جاء فی التشدید فی الخوض فی القدر۔

شے کی قدر و قیمت کا تعین کرنا (to evaluate)۔ قرآن مجید میں یہ لفظ ایک سے زائد مرتبہ آیا ہے‘ مثلاً: ﴿مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ﴾ (الحج:۷۴) ’’ان لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہیں جانی جیسے کہ اس کی قدر کا حق تھا‘‘۔ ہم یہ تو کہہ دیں گے کہ وہ ’’عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ‘‘ ہے‘ ہر چیز پر قادر ہے‘ لیکن وہ کتنا قدیر ہے؟ یہ ہمارے علم میں نہیں آ سکتا۔ اس لیے کہ ہمارے ذہن کی ترازو گویا سنار کی ترازو کی مانند ہے جس میں تولے اور ماشے تلتے ہیں‘ ٹنوں سر یا نہیں تولا جا سکتا۔ اس حوالے سے نبی آخر الزماں ﷺ کی ایک دعا کے الفاظ ملاحظہ ہوں: ((مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ)) ’’اے اللہ! ہم تیری معرفت حاصل نہ کر سکے جیسا کہ تیری معرفت کا حق ہے‘‘ ((وَمَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ)) ’’اور ہم تیری عبادت نہیں کر سکے جیسا کہ تیری عبادت کا حق ہے‘‘۔ اب دیکھئے کہ یہ حضور ﷺ فرما رہے ہیں‘ تا بہ دیگراں چہ رسد! میں اور آپ کس گنتی میں آئیں گے! اسی حوالے سے ایک بڑا عمدہ نکتہ ملاحظہ ہو کہ میدانِ حشر کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لِوَاءُ الْحَمْدِ يَوْمَئِذٍ بِيَدِيْ))(۱) ’’اُس دن اللہ کی حمد کا جھنڈا میرے ہاتھ میں ہوگا‘‘۔ حضور ﷺ کا نام محمد بھی ہے‘ احمد بھی ہے‘ حامد بھی ہے‘ محمود بھی ہے۔ یعنی یہ سارا معاملہ حمد کے گرد ہی گھومتا ہے‘ تو اس اعتبار سے قیامت کے دن دربارِ الٰہی میں اللہ کی حمد کا جھنڈا بھی رسول اللہ ﷺ کے پاس ہوگا۔ اب وہ دربارِ الٰہی کیا ہوگا‘ یہ تو ہم سمجھ نہیں سکتے‘ البتہ کبھی امیر خسرو نے کہا تھا ؎

خدا خود میر محفل بود اندر لا مکاں خسرو
محمدؐ شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم!

اللہ نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے!

لفظ ’’قدر‘‘ کے حوالے سے جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ اس سے ایک تو لفظ ’’قدرت‘‘ بنا ہے اور ایک کسی شے کی قدر و قیمت۔ کسی شے کا اندازہ مقرر کر دینا بھی قدر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔ مشکوٰۃ شریف میں ’’کتاب

(۱) سنن الترمذی‘ کتاب المناقب‘ باب فی فضل النبی ﷺ۔

الایمان‘‘ کا ایک پورا باب ’’باب الایمان بالقدر‘‘ کے عنوان سے ہے‘ اور اس کی پہلی حدیث مسلم شریف کی روایت ہے جو حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ حضرت عمروؓ بن العاص سردارانِ قریش میں سے تھے۔ آپؓ ایک بڑے سیاست دان اور بڑے بہادر انسان تھے‘ ان کے بیٹے عبداللہؓ سے یہ روایت مروی ہے —— اس حوالے سے بڑی دلچسپی کی بات یہ ہے کہ باپ اور بیٹے کے مزاج میں بُعد المشرقین تھا‘ بایں طور کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ جنگجو‘ سیاست دان اور بڑے سرداروں میں سے تھے جبکہ حضرت عبداللہ انتہائی زاہد اور عابد تھے۔ ان کے بارے میں آتا ہے کہ یہ پوری پوری رات نوافل پڑھتے اور ہر روز روزہ رکھتے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ کو ان کے اس معمول کا پتا چلا تو آپ ﷺ نے انہیں بلا کر فرمایا: ((يَا عَبْدَ اللّٰهِ اَلَمْ اُخْبَرْ اَنَّكَ تَصُوْمُ النَّهَارَ وَتَقُوْمُ اللَّيْلَ)) ’’اے عبداللہ! مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم ہر روز روزہ رکھتے ہو اور پوری پوری رات (نفل میں) قیام کرتے ہو!‘‘ آپؓ نے کہا: بَلٰی یَارَسُوْلَ اللّٰهِ ’’جی ہاں‘ یا رسول اللہ‘‘۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((فَلَا تَفْعَلْ.....))(۱) ’’ایسا مت کیا کرو‘‘ —— یہی عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما صحیح مسلم کی اس حدیث کے راوی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((كَتَبَ اللّٰهُ مَقَادِيْرَ الْخَلَائِقِ قَبْلَ اَنْ يَخْلُقَ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضَ بِخَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ))(۲) ’’اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی مقداریں اور تقدیریں لکھ دی تھیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے پچاس ہزار سال قبل‘‘۔ یہ ہے قدر یا تقدیر۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا اندازہ ہزاروں سال پہلے مقرر کر دیا تھا۔

لفظ ’’کتاب‘‘ سے مراد اللہ کا علم قدیم ہے!

زیر مطالعہ حدیث میں ((فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ)) کے الفاظ آئے ہیں۔ یہاں ’’کتاب‘‘ سے مراد کیا ہے؟ اس حوالے سے سورۃ الحدید کی آیت ۲۲ ملاحظہ ہو جو میں نے خطاب کے آغاز میں پڑھی تھی: ﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب النکاح‘ باب لزوجك علیك حق۔

(۲) صحیح مسلم‘ کتاب القدر‘ باب حجاج آدم و موسیٰ علیہما السلام۔

اَنۡفُسِكُمۡ﴾ ''نہیں پڑتی کوئی مصیبت نہ زمین میں اور نہ تمہاری جانوں میں''۔ زمین پر سیلاب اور زلزلے جیسے حوادث کا آ جانا' اسی طرح تمہاری جان میں کسی تکلیف کا آ جانا' مثلاً ٹھیک ٹھاک تھے' کوئی معمولی سی تکلیف ہوئی تو چیک اپ سے معلوم ہوا کہ کینسر ہے اور وہ بھی کافی بڑھ چکا ہے یا اسی طرح کی کوئی اور تکلیف یا مصیبت ﴿اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَهَا ؕ﴾ ''مگر وہ ایک کتاب میں لکھی ہوئی موجود ہے اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کر دیں''۔ ﴿اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرٌ ﴿۲۲﴾﴾ ''(یہ تمہیں مشکل نظر آئے گا مگر) یقیناً یہ اللہ پر بہت آسان ہے''۔ اس آیت میں تقدیر کے حوالے سے ''کتاب'' کا لفظ آیا ہے' اسی طرح قرآن مجید میں اور بھی کئی مقامات پر کتاب کا لفظ آیا ہے تو اس کتاب سے مراد اللہ تعالیٰ کا علم قدیم ہے جس میں سب کچھ ہمیشہ سے موجود اور لکھا ہوا ہے اور اس میں سے کچھ بھی غلط نہیں ہو سکتا۔

یہاں ایک بات جان لیجیے کہ اللہ تعالیٰ کا علم قدیم ہے' حادث نہیں ہے۔ بعض گمراہ فرقوں کا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی شے جب ظہور پذیر ہوتی ہے تو اللہ کے علم میں آتی ہے۔ اسے ''بدع'' کہتے ہیں۔ معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ' یہ شانِ خداوندی سے بہت بعید ہے۔ وہ تو عالِم ماکان وما یکون ہے۔ جو بھی کچھ تھا' یا آج تک رہا ہے اور جو بھی کچھ ہوگا وہ سب کچھ اس کے علم میں ''آنِ واحد'' میں موجود ہے۔

آنِ واحد کے لفظ کو میرے ایک تجربے کے حوالے سے اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ ۶۸۔۱۹۶۷ء میں' میں نے پہلا ہوائی سفر لاہور سے کراچی کا کیا تھا۔ اُس وقت فوکر فرینڈ شپ چلا کرتا تھا جو ایک چھوٹا سا طیارہ تھا جو زیادہ بلندی پر نہیں جاتا تھا۔ میں اس سفر کے دوران کھڑکی سے دیکھتا جاتا تھا کہ اس وقت ہم کہاں پہنچ گئے ہیں اور اب جو روشنیاں نظر آ رہی ہیں یہ کس شہر کی ہیں۔ اوکاڑہ' ساہیوال اور کچھ دوسرے شہر گزرنے کے بعد ایک دم میں نے لودھراں' بہاولپور اور سمہ سٹہ کی روشنیاں بیک وقت دیکھیں۔ تب مجھے یہ خیال آیا کہ جب میں ٹرین کے ذریعے کراچی جاتا ہوں تو لودھراں پہنچ کر میں سمجھتا ہوں کہ ابھی بہاولپور آدھ گھنٹے بعد آئے گا' اس طرح وہ میرے لیے مستقبل کی

شے ہے اور جب میں بہاولپور پہنچتا ہوں تو لودھراں میرے لیے ماضی بن جاتا ہے اور آدھے گھنٹے کے بعد آنے والا سمہ سٹہ میرے لیے مستقبل بن جاتا ہے۔ یعنی ایک وقت میں ایک ماضی ہوتا ہے اور دوسرا مستقبل' لیکن فوکر کی اس تھوڑی سی بلندی پر میں بیک وقت لودھراں' بہاولپور اور سمہ سٹہ دیکھ رہا ہوں۔ اب اس بلندی کو اربوں کھربوں سے ضرب دے دیجیے کہ اللہ تعالیٰ اس بلند مقام سے دیکھ رہا ہے جہاں اُس کے مشاہدے اور علم میں ماضی اور مستقبل کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ہے آنِ واحد کا مطلب۔ اس کے لیے قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر ''کتاب'' کا لفظ آیا ہے۔ یہ درحقیقت اللہ کا علم قدیم ہے جس میں سب کچھ ہمیشہ سے لکھا ہوا موجود ہے' جو پورا ہو کر رہتا ہے۔ عقائد کے حوالے سے ہم اسے ''تقدیر'' کہتے ہیں۔

تقدیر کے دو پہلو

تقدیر کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو ''مَا اَصَابَ عَلَى الۡاِنۡسَانِ'' سے متعلق ہے کہ جو مصیبت انسان پر آتی ہے وہ علمِ الٰہی میں ہمیشہ سے ہے۔ جیسے میں نے ابھی سورۃ الحدید کی آیت پڑھی: ﴿مَاۤ اَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا فِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ﴾ ''نہیں پڑتی تم پر کوئی مصیبت نہ زمین میں اور نہ تمہاری جانوں میں مگر وہ لکھی ہوئی ہوتی ہے''۔ اس حوالے سے ایک حدیث ملاحظہ ہو جو جناب ابن الدیلمی تابعی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ یہ ایک طویل حدیث ہے اور اس کا آخری حصہ کچھ یوں ہے: ((وَتَعْلَمَ اَنَّ مَا اَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ)) ''اور تو جان لے اس بات کو کہ جو چیز تم پر آئی ہے وہ ہرگز ٹلنے والی نہیں تھی''۔ یعنی تم کوئی تدبیر بھی کر لیتے' کوئی قدم بھی اٹھا لیتے' تب بھی وہ تو آنی ہی آنی تھی۔ ((وَاَنَّ مَا اَخْطَاكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيْبَكَ)) ''اور جو چیز تم سے چھوٹ گئی وہ تم کو کسی صورت نہیں ملنی تھی''۔ مثلاً کسی نوکری کا اشتہار آیا' آپ نے بھی درخواست دی لیکن وہ نوکری آپ کو نہیں ملی تو آپ نے سوچا کہ کاش میں نے فلاں سے سفارش کرالی ہوتی تو یہ نوکری مجھے مل جاتی۔ ہرگز نہیں' جو چیز چھوٹ گئی ہے وہ چھوٹ ہی جانی تھی۔ اس میں قطعاً کوئی تدبیر' کوئی سفارش' کوئی حیلہ کارگر نہیں ہو سکتا تھا۔ آخر میں

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((وَلَوْ مُتَّ عَلٰی غَیْرِ ھٰذَا لَدَخَلْتَ النَّارَ))(۱) ''اور اگر تمہاری اس کے سوا کسی اور کیفیت (عقیدہ) پر موت واقع ہوگئی تو سیدھے جہنم میں جاؤ گے''۔ یہ ہے تقدیر کا وہ مفہوم جس کا تعلق ''مَا اَصَابَ عَلَی الْاِنْسَانِ'' سے ہے۔ یعنی جو کچھ انسان کے اوپر وارد ہو رہا ہے اس کے ضمن میں تقدیر کا مفہوم یہ ہے کہ جو ہوا ہے وہ تو ہونا ہی تھا' اس میں تو کسی شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔ لیکن جب انسان کی سوچ کے برعکس کچھ ہوتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ کاش اگر میں یوں کر لیتا تو یہ نہ ہوتا' بس یہی سوچ ایمان بالقدر کے منافی ہے۔ اس لیے کہ جو ہوا ہے وہ تو اللہ تعالیٰ کے علم قدیم میں پہلے سے طے تھا اور اسے تو ہونا ہی تھا' تمہاری کوئی تدبیر اس میں کارآمد نہیں ہونی تھی۔ چنانچہ حدیث میں الفاظ آئے ہیں: ((وَاِنْ اَصَابَكَ شَیْءٌ فَلَا تَقُلْ لَوْ اَنِّیْ فَعَلْتُ كَانَ كَذَا وَكَذَا وَلٰكِنْ قُلْ قَدَّرَ اللّٰهُ وَمَا شَاءَ فَعَلَ فَاِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّیْطَانِ))(۲) ''اور اگر تم پر کوئی مصیبت واقع ہو جائے تو یہ نہ کہو کہ کاش میں ایسا ایسا کر لیتا بلکہ تم کہو کہ یہ تو اللہ نے میرے لیے مقدر کیا تھا اور وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے' اس لیے کہ لفظ ''لَوْ'' (کاش) سے شیطانی عمل کا دروازہ کھل جاتا ہے۔''

تقدیر کا دوسرا پہلو ''مَا یَفْعَلُ الْاِنْسَانُ'' سے متعلق ہے۔ یہاں آ کر تقدیر کا مسئلہ بہت ٹیڑھا ہو جاتا ہے کہ آیا اعمال وافعال کے حوالے سے انسان کے پاس کوئی اختیار ہے کہ نہیں؟ (Do I have any free choice?) یا ہر شے پہلے سے طے شدہ ہے؟ اس حوالے سے بعض روایات بھی ہیں جو اس کی تائید کرتی ہیں کہ ہر چیز پہلے سے طے شدہ ہے' لکھی ہوئی ہے۔ اربعین نووی کی زیر درس حدیث گویا اس کی مثال ہے کہ ہر چیز پہلے سے لکھ دی گئی ہے اور رحم مادر ہی میں لکھ دیا گیا تھا کہ یہ بدبخت ہے یا سعادت مند۔ اب ایک شخص ساری عمر نیکی کے کام کرتا رہا اور آخری وقت میں آ کر کوئی ایسا حادثہ پیش آ گیا کہ اس نے اہل جہنم کے سے کام شروع کر دیے اور وہ جہنمی ہو گیا۔ یا ایک شخص

(۱) سنن ابی داؤد' کتاب السنة' باب فی القدر۔
(۲) صحیح مسلم' کتاب القدر' باب فی الامر بالقوة وترك العجز والاستعانة بالله۔

ساری عمر جہنمیوں کے سے کام کرتا رہا اور آخری وقت میں آ کر کوئی ایسی توفیق ملی' کوئی ایسا معاملہ ہو گیا کہ توبہ کر لی اور اہل جنت کے سے اعمال شروع کر دیے اور اس طرح وہ جنتی ہو گیا —— تقدیر کا یہ دوسرا پہلو کہ انسان جو کچھ کرتا ہے اس میں اس کی قدرت کس قدر ہے' یہ ہمارے ہاں فلسفہ کا بڑا مشکل موضوع ہے اور اسی کا نام ''جبر وقدر'' ہے۔

انسان اپنے افعال میں نہ مجبورِ محض ہے اور نہ قادرِ مطلق

ہمارے ہاں ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جو اس پر قناعت کرتے ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے کہہ دیا' اس سے آگے مین میخ نہیں نکالتے۔ یہ لوگ محفوظ راستے پر ہیں۔ لیکن بہرحال انسان کو اللہ نے عقل بھی دی ہے اور یہ عقل سوالات اٹھاتی ہے اور زیادہ ذہین انسان سوچتے ہیں' غور وفکر کرتے ہیں' بات سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے ہمارے ہاں دو طبقے ہو گئے' جبریہ اور قدریہ۔ جبریہ فرقے کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان مجبور محض ہے اور اسے کوئی اختیار حاصل نہیں' جبکہ دوسرا نقطہ نظر اس کے بالکل برعکس ہے کہ انسان قادر مطلق ہے۔ اور جو چاہتا ہے کرتا ہے' وہ اپنے فیصلے میں مختار مطلق ہے' اس نقطہ نظر کے حاملین کو قدریہ کہا جاتا ہے۔ اس ضمن میں علامہ اقبال کا یہ شعر مجھے شعر ہونے کے اعتبار سے بہت خوبصورت لگتا ہے ؎

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مؤمن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند!

اس شعر میں انسان سے ہر قسم کی پابندی کی نفی کر دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ صرف اللہ کے احکام کا پابند ہے۔ نتیجہ کے اعتبار سے یہ بات صحیح ہے کہ پابندی اصل میں اللہ کے احکام کی ہے' لیکن تقدیر کی پابندی سے بھی انسان پوری طرح آزاد نہیں ہے۔ یہ سمجھ لینا کہ تقدیر کی پابندی صرف نباتات و جمادات ہی کا معاملہ ہے' مبالغہ ہے' اور ظاہر بات ہے کہ کوئی شاعر' چاہے وہ علامہ اقبال ہی ہو' مبالغے سے نہیں بچ سکتا۔ سورۃ الشعراء میں عام شعراء کی جو صفات بیان ہوئی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ وہ مبالغہ کرتے ہیں:

﴿وَالشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ یَّهِیْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾

وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۶﴾

''اور شاعروں کی پیروی تو گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں سرگرداں پھرتے ہیں اور کہتے وہ کچھ ہیں جو کرتے نہیں ہیں۔''

یہ بات علامہ اقبال پر بھی چسپاں ہوتی ہے' اس لیے کہ ان کا فکر جتنا بلند تھا ان کا عمل اس کے اعتبار سے بہت ہی نیچے اور بہت ہی کم تھا۔ بہرحال اس شعر میں انہوں نے جو بات کہی ہے وہ صحیح نہیں ہے' اس لیے کہ انسان بہت سے اعتبارات سے مجبور ہے۔ سب سے پہلے انسان کے اندر ایک ''تقدیر نوعی'' ہے۔ ایک چھوٹی سی چڑیا اڑتی پھرتی ہے لیکن انسان نہیں اُڑ سکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ انسان نے جہاز ایجاد کر لیا جو پانچ پانچ سو آدمی اور سینکڑوں من سامان لے کر اڑتا ہے لیکن انسان خود تو نہیں اڑ سکتا۔ یہ تقدیر نوعی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نوع (species) کے لیے ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے اور وہ اس اندازے میں ہی رہے گا' اس سے باہر نہیں جا سکتا۔

اس کے علاوہ انسان میں ایک ''تقدیر شخصی'' ہے۔ بعض اوصاف وصفات انسان کو وراثتاً ملتے ہیں' جن کے بارے میں اس کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے۔ یہ بات پہلے بھی مانی جاتی تھی اور آج سائنسی انداز میں اسے یوں کہا جاتا ہے کہ یہ چیز آپ کے جینز (genes) میں ہے اور جینز کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ جو اوصاف وصفات آپ کو اپنے والدین کی طرف سے ملتے ہیں وہ آپ کی شخصیت کو فیصلہ کن طرز پر ڈھال دیتے ہیں۔ اب یہ جینز بھی ایک طرح کی پابندی ہے۔ دوسرے یہ کہ خاص طور پر ماں کی گود اور گھر کے ابتدائی ماحول کے جو اثرات انسانی شخصیت کے اوپر مرتسم ہوتے ہیں وہ بھی بڑے مستقل اور پختہ ہوتے ہیں۔ ان دونوں چیزوں یعنی نوع اور شخصیت کو آپس میں ضرب دے لیجیے تو اس سے ایک شے تیار ہوتی ہے جس کو قرآن ''شاکلہ'' کہتا ہے: ﴿قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ۭ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴿۸۴﴾﴾ (بنی اسرائیل) ''کہہ دو کہ ہر شخص اپنے شاکلہ کے مطابق عمل کرتا ہے۔ سو تمہارا پروردگار اس شخص سے خوب واقف ہے جو سب سے زیادہ سیدھے راستے پر ہے''۔ شاکلہ کہتے ہیں شکل دینے

والی شے کو۔ مثلاً آپ نے لوہا ڈھال کر کوئی خاص پرزہ بنانا ہے تو سب سے پہلے آپ کو اس کا سانچہ (pattern) بنانا پڑے گا' پھر لوہے کو پگھلا کر اس میں ڈالیں گے تو جیسا سانچہ ہوگا لوہا ویسی ہی شکل اختیار کرے گا۔ اسے شاکلہ کہتے ہیں۔ یہ شاکلہ ہر انسان کا مختلف ہے اور انسان اس سے باہر نہیں جا سکتا' اس کے اندر اندر ہی اس کی جدوجہد (struggle) ہو گی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کو کوئی اختیار (free choice) حاصل نہیں ہے۔ آپ کو اختیار حاصل ہے' لیکن وہ اختیار اپنی حدود کے اندر کام کرے گا' اس سے باہر نہیں جا سکتا۔

اس بات کو مختلف احادیث میں حضور ﷺ نے بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ایک حدیث بڑی اہم ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلنَّاسُ مَعَادِنُ)) ''انسان معدنیات کی طرح ہیں''۔ آپ جانتے ہیں کہ معدنیات میں سے جس کچ دھات (ore) کو صاف کر لیا جائے وہی دھات خالص شکل میں حاصل ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ سونے کی ore سے سونا بنے گا اور چاندی کی ore سے چاندی ہی بنے گی' سونا تو نہیں بن سکتا' اسے جتنا چاہیں صاف کر لیں۔ اس اعتبار سے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اَلنَّاسُ مَعَادِنُ)) ''انسان بھی معدنیات کی طرح ہیں''۔ یعنی ان کی ore بھی مستقل بالذات ہے۔ آگے فرمایا: ((خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْاِسْلَامِ اِذَا فَقِهُوْا))[1] ''ان میں جو جاہلیت کے دور میں بہترین تھے وہی اسلام میں بھی بہترین ہیں جبکہ ان کے اندر دین کا فہم آ جائے''۔ یعنی اگر دورِ جاہلیت میں وہ ore سونے کی تھی تو اسلام نے اسے صاف کر کے خالص سونا بنا دیا اور اگر وہ چاندی کی ore تھی اور اسلام نے اس کو صاف کر دیا تو وہ نکھرتی ہوئی' چمکتی ہوئی چاندی بن گئی۔ البتہ اس میں ایک اضافہ کیا حضور ﷺ نے کہ ایسا تب ہوگا جب ان کے اندر دین کا فہم داخل ہو جائے۔ اب آپ دیکھیں کہ اسلام لانے سے پہلے بھی بہترین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے اور اسلام لانے کے بعد بھی بہترین حضرت ابوبکرؓ

(۱) صحیح البخاری' کتاب المناقب' باب قول الله تعالی: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ...﴾

ہی ہیں۔ حضور ﷺ کو نبوت ملنے سے پہلے بھی بہترین خاتون حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ تھیں اور آپؐ کی نبوت پر ایمان لانے کے بعد بھی بہترین خاتون حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ ہی ہیں۔

اس ضمن میں ایک اور حدیث حضرت ابودرداء ؓ سے مروی ہے' وہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک روز حضور ﷺ کے پاس تھے اور ہم سوچ رہے تھے کہ دنیا میں کیا کیا پیش آنے والا ہے۔ اس دوران حضور ﷺ نے ہم سے ایک بات کہی: ((اِذَا سَمِعْتُمْ بِجَبَلٍ زَالَ عَنْ مَكَانِهٖ فَصَدِّقُوْا)) ''اگر تم یہ سنو کہ کوئی پہاڑ اپنی جگہ سے ہل گیا ہے تو مان لینا''۔ ((وَاِذَا سَمِعْتُمْ بِرَجُلٍ تَغَيَّرَ عَنْ خَلْقِهٖ فَلَا تُصَدِّقُوْا))(۱) ''اور اگر تم سنو کہ کوئی شخص اپنی جبلت سے بدل گیا ہے' تو کبھی نہ ماننا''

ایمان بالقدر کی اہمیت

ایمان بالقدر کی اہمیت کے حوالے سے ایک اور حدیث ملاحظہ کیجیے کہ تقدیر پر ایمان کس قدر لازم ہے۔ ایک تابعی جناب ابن دیلمی ؒ فرماتے ہیں کہ میرے دل میں تقدیر کے بارے میں کچھ وسوسے پیدا ہوئے تو میں نے اس کے بارے میں جاننے کے لیے جو بھی کبار صحابہؓ اس وقت بقید حیات تھے' ان سب سے ملاقات کی۔ سب سے پہلے میں حضرت اُبی بن کعب ؓ کے پاس گیا (جن کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا ہے: ''میرے صحابہؓ میں قرآن کا سب سے بڑا عالم اُبی بن کعب ہے۔'') ان کے علاوہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کے پاس گیا (جو اربعین نووی کی زیر درس حدیث کے راوی ہیں اور فقہاء صحابہ میں سے ہیں۔) پھر میں حذیفہ بن یمان ؓ اور آخر میں زید بن ثابت ؓ کے پاس گیا۔ ان سب نے درج ذیل بات کہی' جبکہ زید بن ثابتؓ نے اس بات کو مرفوعاً نقل کیا' یعنی یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں بیان کر رہا بلکہ یہ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ((لَوْ اَنَّ اللّٰهَ عَذَّبَ اَهْلَ سَمَاوَاتِهٖ وَاَهْلَ اَرْضِهٖ عَذَّبَهُمْ وَهُوَ غَيْرُ ظَالِمٍ لَهُمْ)) ''اللہ تعالیٰ اگر تمام آسمان والوں اور تمام زمین والوں کو عذاب دینا چاہے تو وہ عذاب دے سکتا ہے' بغیر اس کے کہ ہم کہیں کہ وہ ظالم

(۱) مسند احمد' کتاب من مسند القبائل' باب من حدیث ابی الدرداء عویمر' ح۲۶۲۲۷۔

ہے''۔ ظاہر ہے تمام زمین والوں اور آسمان والوں میں نیکوکار بھی آ گئے۔ یہ اصل میں ایک بڑا اہم مسئلہ ہے جو اہلِ سنت والجماعت اور معتزلہ کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ معتزلہ کے طرز پر اہلِ تشیّع کا بھی عقیدہ یہ ہے کہ اللہ پر عدل واجب ہے' جبکہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک اللہ پر کوئی شے واجب نہیں ہے۔ اللہ کا اختیار مطلق ہے' وہ جو چاہے کرے۔ چنانچہ وہ جب چاہے کسی ظالم کو معاف کر سکتا ہے اور جب چاہے کسی نیک آدمی کو عذاب دے سکتا ہے: ﴿يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ (البقرۃ) ''پھر وہ بخش دے گا جس کو چاہے گا اور عذاب دے گا جس کو چاہے گا۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

آگے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((وَلَوْ رَحِمَهُمْ كَانَتْ رَحْمَتُهٗ خَيْرًا لَهُمْ مِنْ اَعْمَالِهِمْ)) ''اور اگر اللہ ان (تمام آسمان والوں اور تمام زمین والوں) پر رحم کرے تو اُس کی رحمت یقیناً لوگوں کے اعمال سے بہت بالا ہے''۔ یعنی اس کی رحمت بہت بلند و برتر ہے' وہ جو چاہے کرے۔ وہ اگر ابوجہل کو بخش دے یا کسی انتہائی نیک شخص کو عذاب دے تو کون اعتراض کر سکتا ہے؟ آگے فرمایا: ((وَلَوْ اَنْفَقْتَ مِثْلَ اُحُدٍ ذَهَبًا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَا قَبِلَهُ اللّٰهُ مِنْكَ حَتّٰى تُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ)) ''اور اگر تم اُحد پہاڑ کے برابر سونا اللہ کی راہ میں خرچ کرو تو اللہ تعالیٰ اسے قبول نہیں کرے گا جب تک کہ تم تقدیر پر ایمان نہیں رکھو گے''۔ حدیث کے آخری حصہ کا ذکر ماقبل بھی ہو چکا ہے۔ ((وَتَعْلَمَ اَنَّ مَا اَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ)) ''اور تم جان لو کہ جو چیز (مصیبت یا تکلیف) تم پر واقع ہوئی ہے وہ ٹلنے والی تھی ہی نہیں''۔ یعنی وہ تو اللہ تعالیٰ کے علم قدیم کے اندر پہلے سے لکھی ہوئی موجود تھی اور وہ تو آنی ہی آنی تھی۔ ((وَاَنَّ مَا اَخْطَاكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيْبَكَ)) ''اور جو چیز تم سے چھوٹ گئی وہ تمہیں ملنی ہی نہیں تھی''۔ آخر میں فرمایا: ((وَلَوْ مُتَّ عَلٰى غَيْرِ هٰذَا لَدَخَلْتَ النَّارَ))(۱) ''اور اگر اس عقیدے کے سوا کسی اور پر تمہاری موت واقع ہوئی تو تم جہنم میں داخل ہو گے''۔ یہ ہے ایمان بالقدر کی اہمیت۔

(۱) سنن ابی داؤد' کتاب السنۃ' باب فی القدر۔

ایمان بالقدر کی وضاحت

اب میں تقدیر کے اس مشکل مسئلہ کو انگریزی کی دو اصطلاحات کے حوالے سے واضح کروں گا۔ ایک ہے preknowledge یعنی کسی چیز کا پہلے سے علم ہونا اور ایک ہے predetermination یعنی کسی شے کا پہلے سے طے پا جانا۔ ان دونوں میں خلط مبحث نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ کے علم قدیم کو جبر مستلزم نہیں ہے' بایں معنی کہ اس کے علم میں ہے کہ آپ یہ کام کریں گے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ آپ وہ کام اس کے جبر کے تحت کر رہے ہیں۔ میں اس کی ایک سادہ سی مثال دیا کرتا ہوں۔ آپ کسی بچے کے سامنے کوئی کھلونا رکھتے ہیں تو آپ کو تقریباً سو فیصد یقین ہوتا ہے کہ وہ اس کھلونے کی طرف متوجہ ہوگا' اسے اٹھائے گا' لیکن ہوسکتا ہے کہ بچہ اُس وقت کسی اور دھن میں ہو اور وہ اس کھلونے کی طرف توجہ نہ کرے۔ اور اگر وہ اسے اُٹھا بھی لیتا ہے تو اُس نے آپ کے مجبور کرنے سے نہیں اٹھایا بلکہ اس نے اپنے ارادے اور اختیار سے اٹھایا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا جو اندازہ مقرر کیا ہوا ہے وہ اندازہ (جسے تقدیر کہا جاتا ہے) اللہ کا علم قدیم ہے جو کبھی غلط ثابت نہیں ہوسکتا' اس لیے کہ وہ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡم ہے۔ اب اگر preknowledge اور predetermination کے اندر فرق کر لیا جائے تو معاملہ سمجھ میں آ جائے گا کہ انسان اپنے افعال میں مجبور نہیں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق جو چیز لکھ دی گئی ہے وہ تو ہو کر رہے گی' لیکن اُس کے کرنے میں آپ پر کوئی جبر نہیں ہے۔

ایمان بالقدر کے ثمرات

اب میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس عقیدۂ تقدیر کے کیا کیا سبق ہیں' اس کے کیا کیا ثمرات ہیں اور کتنی بڑی بڑی نعمتیں اس میں پوشیدہ ہیں۔ سورۃ الحدید کی یہ آیت ہم قبل ازیں پڑھ آئے ہیں:

﴿مَاۤ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرٌ ﴿۲۲﴾﴾

"نہیں پہنچتی کوئی مصیبت نہ زمین میں اور نہ تمہاری جانوں میں مگر یہ سب کچھ ایک کتاب میں لکھا ہوا موجود ہے اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کر دیں۔ یقیناً یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔"

اب اس کا جو نتیجہ نکلتا ہے وہ اس سے اگلی آیت میں بیان ہوا ہے: ﴿لِّکَیۡلَا تَاۡسَوۡا عَلٰی مَا فَاتَکُمۡ وَلَا تَفۡرَحُوۡا بِمَاۤ اٰتٰىکُمۡ ؕ﴾ "تاکہ تم رنج و غم نہ کیا کرو اس چیز پر جو تمہارے ہاتھ سے جاتی رہی اور اترایا نہ کرو اس چیز پر جو اللہ تمہیں دے دے"۔ انسان کا معاملہ یہ ہے کہ جب کوئی تکلیف یا مصیبت آ گئی تو فوراً مایوس ہو گیا' بددل ہو گیا' افسردہ و آزردہ ہو گیا۔ اس سے بھی آگے جھنجھلاہٹ ہوئی کہ کیوں ہوا' کیسے ہوا' نہیں ہونا چاہیے تھا۔ فرض کیجیے کہ آپ پر کوئی تکلیف کسی دوسرے شخص کے ذریعے سے آئی ہے تو اس پر آپ کو غصہ آئے گا اور انتقامی کیفیات پیدا ہوں گی۔ یہ سب کی سب کیفیات صرف اس ایک سوچ سے ختم ہو جاتی ہیں کہ یہ تو اللہ کی طرف سے تھا اور یہ ہونا ہی تھا۔ اب یہ غم و غصہ' رنج و صدمہ' مایوسی (frustration) اور جھنجھلاہٹ' سب کا سب ختم ہو گیا —— یہاں میری یہ بات بھی ذہن نشین کر لیں کہ اس دور میں جو ذہنی بیماریاں ہمارے اندر اور خاص طور پر کھاتے پیتے لوگوں میں بہت زیادہ عام ہو رہی ہیں بلکہ ہو چکی ہیں' ان میں اصل دخل انہی کیفیات کو ہوتا ہے۔ اب اگر انسان کو یہ یقین ہو کہ یہ تو ہونا ہی تھا اور یہ سب اللہ کی طرف سے ہے تو رنج و غم کی یہ ساری کیفیات ختم ہو جائیں گی اور انسان ذہنی بیماریوں سے بھی محفوظ رہے گا۔

اس حوالے سے یہ یاد رکھیں کہ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی نے آپ پر زیادتی کی ہے تو آپ بدلہ نہ لیں۔ اگر کسی نے آپ پر زیادتی کی اور آپ انتقام لینے پر قادر ہی نہیں ہیں تو آپ "قہرِ درویش بر جانِ درویش" کے مصداق اندر ہی اندر پیچ و تاب کھائیں گے' البتہ اگر آپ انتقام پر قادر ہیں تو آپ کے سامنے دو راستے (options) ہیں۔ چاہے تو آپ اسے معاف کر دیں اور چاہے تو آپ اس سے بدلہ لے لیں۔ اب دیکھئے' قرآن حکیم فطرتِ انسانی سے بہت قریب تر اور بہت متوازن کتاب ہے کہ اس

میں ان دونوں کا جواز اور ان دونوں کی حکمت موجود ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر فرمایا: ﴿وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۴﴾ (التغابن) ''اور اگر تم معاف کر دو' اور بخش دو' اور درگزر سے کام لو تو یقیناً اللہ بھی بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے''۔ ایسا رویہ اختیار کرنے سے انسان کو روحانی ترقی حاصل ہوگی۔ لیکن اس میں ایک اندیشہ بھی ہے کہ اُس شخص میں شرارت کرنے کی ہمت مزید بڑھ جائے گی۔ ایک شخص نے آج آپ کو تھپڑ مارا ہے اور آپ نے بھی جوابی تھپڑ رسید کر دیا تو آئندہ کے لیے اسے ہوش آ جائے گا' اور اگر آپ اسے معاف کر دیتے ہیں تو ہوسکتا ہے کہ وہ کل کسی اور کو تھپڑ مار دے۔ اس اندیشہ سے بچنے کے لیے ''قصاص'' یعنی بدلہ لینے کا معاملہ ہے: ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ (البقرۃ:۱۷۹) ''اے عقل والو! قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے''۔ قصاص کو زندگی قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ دُنیا کا نظام قصاص کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اس قصاص ہی کا ایک نظام ہے جو ہم نے اپنے طور پر قائم کر رکھا ہے۔ پولیس' تھانے' عدالتیں اور پھانسی کے تختے سب اسی لیے تو ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو بدمعاش' شریر اور غنڈے آئے دن کسی نہ کسی کو تنگ کرتے رہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہمارے ہاں کرپشن کی وجہ سے یہ چیزیں اب اتنی مؤثر نہیں رہیں' لیکن بہرحال یہ نظام تو اسی لیے بنایا گیا تھا کہ اس سے ان جرائم کی روک تھام ہوگی۔ اب اگر کسی شخص نے آپ کے ساتھ زیادتی کی ہے تو آپ کے پاس معاف کرنے اور انتقام لینے کے دونوں آپشن ہیں۔ آپ کو اس شخص پر زیادہ غصہ اس وقت آئے گا جب آپ یہ سمجھیں کہ اس نے اپنی مرضی سے یہ کیا ہے' لیکن جب آپ کے علم میں ہوگا کہ ایسا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونا ہی تھا تو آپ کا غصہ اتنی شدت کا نہیں ہوگا۔ بہرحال اس شخص نے یہ زیادتی کی ہے لہٰذا آپ اس سے انتقام لینے میں حق بجانب ہیں۔

اس حوالے سے میں ایک واقعہ سنایا کرتا ہوں کہ ایک درویش یہ کہتے ہوئے جا رہا تھا: ''جو ربّ کرے سو ہو' جو ربّ کرے سو ہو!'' ایک شخص نے اسے پتھر مار دیا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا تو پتھر مارنے والے نے کہا: کیا دیکھ رہے ہو؟ جو ربّ کرے سو ہو! اُس

درویش نے کہا کہ مجھے پتھر تو اللہ کے حکم سے ہی لگا ہے لیکن میں دیکھ رہا ہوں بیچ میں منہ کالا کس کا ہوا ہے؟ یعنی وہ کون ہے جس نے اپنے لیے اللہ کا غصہ' اللہ کا عذاب کمایا ہے! بہرحال چونکہ درمیان میں کوئی شخص ذریعہ بن گیا ہے اس لیے آپ اس سے بدلہ لے سکتے ہیں۔

مؤمن سے مطلوب: تقدیر پر یقینِ کامل

سورۃ التوبہ کی جو آیت میں نے خطاب کے آغاز میں آپ کو سنائی اس کا پس منظر سمجھ لیجیے۔ جب حضور ﷺ نے غزوۂ تبوک کا ارادہ کیا اور اعلانِ عام کر دیا کہ ہم سلطنتِ روما کے ساتھ ٹکراؤ کے لیے جا رہے ہیں' اس لیے تمام مسلمان چلیں۔ چنانچہ اس نفیرِ عام کی بدولت آپؐ کی حیاتِ دنیوی کا سب سے بڑا یعنی تیس ہزار کا لشکر آپ کے جلو میں تھا۔ صورتِ حال یہ تھی کہ شدید گرمی تھی' قحط کا عالم تھا اور کھجور کی فصل مکمل تیار تھی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اگر لوگ چلے جائیں تو فصل خراب ہو جائے گی' گل سڑ جائے گی۔ ظاہر بات ہے کہ کھجور کے بلند و بالا درخت کے اوپر چڑھ کر کھجوریں اتارنا عورتوں کے کرنے کا کام تو نہیں ہے۔ ان سخت حالات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا شدید ترین امتحان ہو گیا اور منافقین نے کہا کہ ہوش کے ناخن لو' کیا تم اس شدید گرمی اور قحط کے عالم میں شہنشاہِ روم سے ٹکرانے جا رہے ہو' کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟ تو اس کا جواب زیرِ مطالعہ آیت میں نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے دلوایا گیا:

﴿قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۵۱﴾ (التوبۃ)

''کہہ دو کہ ہم پر کوئی مصیبت واقع نہیں ہو سکتی مگر وہی جو ہمارے ربّ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے' وہ ہمارا مولیٰ ہے' اور اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے ایمان والوں کو۔''

ایمان والوں نے منافقین کو یہ جواب دیا کہ اللہ ہی ہمارا دوست ہے' وہ ہمارا پشت پناہ اور ہمارا ولی ہے۔ وہ جو کرے ہمیں قبول ہے ع ''سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے''۔

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی!

یعنی اللہ کی طرف سے جو بھی آئے وہ ہمارے لیے خوش آئند ہے‘ چاہے ہمیں وقتی طور پر ناگوار محسوس ہو یا وہ جسمانی طور پر تکلیف دہ ہو۔ اسی کا نام تسلیم و رضا ہے‘ یعنی اللہ کی تقدیر پر راضی رہنا اور کوئی شکوہ و شکایت نہ ہونا‘ نہ اللہ سے اور نہ کسی اور سے۔ اسی کیفیت کا نام نفس مطمئنہ ہے۔ جیسے تیز سے تیز آندھی بھی مضبوط چٹان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی اسی طرح وہ شخص جس کا اللہ پر اور اللہ کے علم قدیم پر ایمان ہو وہ بھی ان مصائب میں نہیں ڈگمگائے گا۔

انسان اپنے افعال میں کتنا آزاد اور کتنا مجبور ہے؟

’’جبر و قدر‘‘ کی بحث ہمارے ہاں متکلمین کے درمیان بہت عرصہ سے چلی آ رہی ہے لیکن یہ معاملہ حل نہیں ہو سکا۔ میں اس حوالے سے ہلکی سی کوشش کر رہا ہوں‘ اس لیے کہ آج سائنس کی ترقی کی وجہ سے بہت سی چیزیں سمجھانی آسان ہو گئی ہیں۔ اس حوالے سے اجمالی گفتگو قبل ازیں ہو گئی ہے اور میں نے اقبال کا شعر بھی آپ کو سنایا تھا:

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مؤمن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند!

یہ شعر اپنے اصل کے اعتبار سے ٹھیک ہے کہ بندۂ مؤمن کے لیے اصل پابندی صرف اللہ کے احکام کی ہے‘ لیکن یہ کہنا کہ اس کے علاوہ کوئی اور پابندی نہیں ہے‘ یہ درست نہیں ہے‘ اس لیے کہ انسان بہت سے اعتبارات سے مجبور ہے۔ مثلاً میں اگر ہندوستان میں پیدا ہوا تو اس میں میرا کوئی اختیار (choice) تو نہیں تھا‘ اللہ تعالیٰ مجھے انگلستان میں بھی پیدا کر سکتا تھا۔ اس طرح مجھے جو شکل و صورت ملی ہے‘ جو رنگت ملی ہے اس میں بھی میرا کوئی اختیار نہیں تھا۔ ظاہر بات ہے کہ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ (given) ہیں۔ تو اس معاملے میں آپ اپنے جینز (genes) میں رہنے پر مجبور ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے: ’’One can not grow out of his skin‘‘ یعنی کوئی شخص اپنی کھال

(چمڑی) سے تو باہر نہیں آ سکتا۔ آپ فربہ ہوتے چلے جائیں تو وہ کھال بھی پھیلتی چلی جائے گی اور آپ کھال سے باہر نہیں نکلیں گے۔ اس کو ’’تقدیر نوعی‘‘ کہتے ہیں۔

ایک ہے ’’تقدیر شخصی‘‘ کہ زندگی کے بالکل ابتدائی دور میں‘ ماں کی گود میں‘ اور گھر کے ابتدائی ماحول میں جو اثرات نفسیاتی طور پر مرتب ہوتے ہیں وہ مستقل ہوتے ہیں۔ اب تقدیر نوعی اور تقدیر شخصی کو آپس میں ضرب دینے سے ایک شاکلہ وجود میں آتا ہے۔ اس لفظ کے حوالے سے تفصیلی گفتگو قبل ازیں ہو چکی ہے —— اس ضمن میں یہاں ایک اور بات نوٹ کریں کہ شاکلہ کے حوالے سے جدید دور کے ماہرین نفسیات میں سے میکڈوگل کو بہت بڑا دھوکہ لگا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی شخصیت پوری کی پوری صرف اسی ایک اصول پر مبنی ہے: ’’no free choice‘‘ یعنی انسان کو اپنے افعال میں کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ انسان کا یہ سمجھنا کہ یہ میں خود کر رہا ہوں‘ محض دکھاوا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ تمہارے جینز میں تھا‘ تمہاری ابتدائی تعلیم اور تربیت کے اندر تھا اس لیے تم یہ کر رہے ہو اور اس میں تمہارا کوئی اختیار نہیں ہے۔ لیکن قرآن اس نظریے کی نفی کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس شاکلہ (pattern) کے ہوتے ہوئے بھی انسان کو ایک اختیار ملتا ہے: ﴿اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝۳﴾ ’’یقیناً ہم نے انسان کو راہ دکھا دی اب وہ شکر گزار بنے یا ناشکرا (یہ اس کا اختیار ہے)‘‘۔ اب ظاہر بات ہے کہ راستہ چننے کا اختیار انسان کو ہے اور اِس اختیار کے اعتبار سے انسان یا تو موردِ الزام ٹھہرے گا یا اجر و ثواب کا مستحق ہو گا‘ یعنی شکر کی روش اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر و ثواب ملے گا اور اگر کفر یا کفرانِ نعمت کا رویہ اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا ملے گی۔

واضح رہے کہ انسان اگرچہ اس شاکلہ سے باہر نہیں نکل سکتا‘ لیکن اس کے اندر رہتے ہوئے وہ مجبورِ محض بھی نہیں ہے۔ قرآن میں کتنی مرتبہ یہ بات آئی ہے: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ ’’اللہ تعالیٰ ہر انسان کو اس کی وسعت کے مطابق مکلّف بناتا ہے‘‘۔ اب کس میں کتنی وسعت ہے؟ کس کا شاکلہ کیسا ہے؟ کس کو کیسے جینز ملے تھے؟ کس کو ماحول کیسا میسر آیا تھا؟ یہ ساری چیزیں اللہ کے علم میں ہیں اور اس کے

حساب سے ہی اللہ تعالیٰ انسان کا محاسبہ کرے گا۔ یہ اندھے کی لاٹھی نہیں ہے کہ ایک پیمانے کے اوپر سب کو جانچا جائے بلکہ ہر ایک کا اس کی وسعت اور قدرت کے حساب سے فیصلہ ہوگا۔ ایک شخص میں قدرت زیادہ تھی مگر اُس نے کم کیا تو وہ فیل ہو جائے گا اور اگر ایک شخص میں قدرت بہت کم تھی اور اس نے تھوڑا سا کر دیا اگرچہ پہلے کے مقابلے میں کم کیا تو وہ کامیاب ہو جائے گا' اس لیے کہ اس میں قدرت ہی کم تھی اور اس کے شاکلہ میں اس سے زیادہ کی وسعت تھی ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں میزانِ عمل کے بارے میں کہیں بھی دو پلڑوں کا ذکر نہیں ہے' بلکہ یہ فرمایا گیا ہے:

﴿فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝۶ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝۷ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝۸ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝۹ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَاهِيَهْ ۝۱۰ نَارٌ حَامِيَةٌ ۝۱۱﴾ (القارعہ)

''پس جس کے (اعمال کا) وزن بھاری ہوگا تو وہ دل پسند عیش میں ہوگا' اور جس (کے اعمال کا) وزن ہلکا ہوگا تو اس کا ٹھکانہ 'ہاویہ' ہے۔ اور تمہیں کیا معلوم 'ہاویہ' کیا ہے؟ آگ ہے دہکتی ہوئی!''

یوں سمجھئے کہ وہ ترازو ایک لٹکنے والی ترازو (spring balance) ہے جس میں دو پلڑے نہیں ہوتے بلکہ اس میں چیز نیچے لٹکا دی جاتی ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا اتنا وزن ہے۔ قیامت کے دن بھی شاکلہ کے اعتبار سے انسان کا حساب ہوگا۔ تو جس کا عمل اپنے شاکلہ کے اعتبار سے کم رہ گیا تو وہ ﴿وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝۸﴾ میں شمار ہوگا اور اگر اس نے اپنے شاکلہ کے اعتبار سے تقاضے پورے کر دیے تو اس کا شمار ﴿فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝۸﴾ میں ہوگا۔

ایمان بالقدر کا تقاضا: اذنِ ربّ اور توفیق ربّ کے بغیر کچھ نہیں ہوگا!

تقدیر کے حوالے سے میں نے یہ عرض کیا کہ اس سے انسان کا خوف ختم ہو جاتا ہے کہ میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا' سوائے اس کے کہ جو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور جو اللہ کے علم میں ہے وہ کبھی ٹل نہیں سکتا۔ اللہ میرا مالک' میرا آقا' میرا دوست ہے اور میری مصلحتوں سے مجھ سے زیادہ واقف ہے۔ میں تو اپنی نگاہ کی محدودیت (short sightedness) کی وجہ سے کسی چیز کو اپنے لیے اچھا سمجھ لیتا ہوں' حالانکہ اصل کے اعتبار سے وہ میرے لیے بری ہوتی ہے اور جسے میں برا سمجھ رہا ہوتا ہوں درحقیقت وہ میرے لیے اچھی ہوتی ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۲۱۶﴾ (البقرۃ) ''اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو اپنے لیے نقصان دہ سمجھو حالانکہ اسی میں تمہارے لیے خیر ہو' اور ہو سکتا ہے کہ کسی چیز کو تم پسند کرو حالانکہ وہ تمہارے لیے بری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے''۔ تقدیر پر ایمان لانے سے ایک تو خوف ختم ہو جاتا ہے اور دوسرا تقدیر سے انسان میں ایک توکل پیدا ہوتا ہے کہ جب تک اللہ کا اذن نہ ہو میں کر بھی کچھ نہیں سکتا اور اللہ کا یہ اذن اس کے قدیم علم کی بنیاد پر ہے۔

قرآن حکیم میں کئی مقامات پر اللہ کے علم کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝۹۲﴾ (ھود) ''یقیناً جو کچھ تم کر رہے ہو میرے ربّ کا علم اُس کا احاطہ کیے ہوئے ہے''۔ اب اگر میں یہ سمجھوں کہ میں اپنی کوشش اور محنت سے کوئی کام کر سکتا ہوں تو یہ بھی اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے' اس لیے کہ میں ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے اللہ کی قدرت اور علم سے باہر تو نہیں جا سکتا۔ اس پہلو سے یہ بات بھی جان لو کہ اللہ کے علاوہ کسی اور پر توکل مت کرو۔ سورۃ التکویر میں فرمایا گیا: ﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۲۹﴾ ''اور تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے مگر وہ جو اللہ رب العالمین چاہے''۔ یعنی صرف تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوگا جب تک کہ اللہ نہ چاہے۔ اسی کو ہم ''توفیق'' کہتے ہیں۔ ایک اذنِ ربی ہے۔ آپ نماز پڑھنے جانا چاہتے ہو' اس ارادہ پر آپ کو ثواب مل جائے گا۔ اب اگر اللہ نہ چاہے تو آپ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے۔ اسی طرح اگر آپ چوری کرنا چاہتے ہیں تو یہ آپ کی choice ہے اور ظاہر بات ہے اس پر آپ کی پکڑ ہوگی' اس لیے کہ چوری کا فیصلہ آپ کا اپنا ہے —— لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ جو شخص نیکی کے راستے پر چلنا چاہتا ہے اس کے لیے اللہ عزوجل کی طرف سے راستے آسان کر دیے جائیں گے: ﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝۷﴾

''پس اس کو ہم آسان طریقے کی توفیق دیں گے''۔ اور جو برائی کا راستہ اختیار کرتا ہے اللہ اسے آہستہ آہستہ سختی میں پہنچا دے گا: ﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ⑩﴾ (اللیل) ''پس ہم اس کے لیے سختی کا راستہ آسان کر دیں گے۔''

الغرض جب انسان کو یہ یقین آ جائے کہ اذنِ رب اور توفیق رب کے بغیر میں کچھ نہیں کر سکتا تو پھر اسی سے توکل جنم لیتا ہے۔ مثلاً اگر آپ نے رات کو فیصلہ کیا کہ صبح آپ نے سفر کرنا ہے اور آپ کے پاس سارے اسباب و وسائل موجود ہیں۔ گاڑی کی بھی آپ نے چیکنگ کروالی ہے' پٹرول کی ٹینکی بھی فل ہے' اس سب کے باوجود اگر آپ نے سمجھا کہ میں چلا جاؤں گا تو آپ دھوکے میں ہیں' فریب میں ہیں۔ سورۃ الکہف میں اس کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے: ﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ㉓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ ''ہرگز کبھی مت کہنا کہ میں یہ کام کل ضرور کروں گا مگر یہ کہ اگر اللہ نے چاہا''۔ انگریزی میں کہتے ہیں: There is many a slip between the cup and the lip دودھ کا پیالہ تمہارے ہاتھ میں ہے اور تمہارا خیال ہے کہ جب میں چاہوں گا اسے پی جاؤں گا' لیکن اس دودھ کے پیالے کو ہاتھ سے ہونٹوں تک آنے میں بہت سے مراحل طے کرنے ہیں۔ اس کے راستے میں نامعلوم کتنی مادی قوتیں موجود ہیں اور ان میں سے کوئی ایک بھی رکاوٹ ڈال دے تو وہ دودھ کا پیالہ آپ کے ہونٹوں تک نہیں پہنچ پائے گا۔

درحقیقت یہ تقدیر کا دوسرا پہلو ہے' لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ محنت نہ کریں اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں' بلکہ آپ امکانی حد تک جدّوجہد کریں اور کبھی یہ نہ سمجھیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے آزاد ہو جائیں گے اور جو جی چاہے کر لیں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ عقیدۂ تقدیر ہمارے لیے سب سے بڑی نعمت ہے اور اس کو سمجھنے کے لیے بس ایک فارمولا کافی ہے کہ ہر چیز اللہ کے علم قدیم میں ہے' لیکن پہلے سے طے شدہ نہیں ہے اور انسان کو ﴿اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا﴾ میں سے کوئی بھی راستہ چننے کا اختیار حاصل ہے۔ تبھی تو یہ جزا و سزا کا سارا معاملہ ہے۔ قرآن مجید کا فلسفہ زندگی جزا و سزا کے گرد گھومتا ہے: ﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ﴾

(الملک:۲) ''اُس نے پیدا کیا موت اور زندگی کو تا کہ تمہاری آزمائش کر سکے کہ تم میں سے کون اچھے اعمال کرتا ہے۔'' ؎

قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

قرآن مجید کا فلسفہ زندگی و موت یہی ہے کہ اللہ نیکوکاروں کو ان کے اعمال کے بدلے اجر و ثواب اور اپنی نعمتوں سے نوازے گا اور برے لوگوں کو ان کی برائیوں کے سبب سزا دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اعمال کے نتائج کے اعتبار سے ہر شخص کا سامان تیار کر رکھا ہے۔ بدبخت لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔ اسی طرح اہل ایمان کے لیے اللہ تعالیٰ نے جنت تیار کر رکھی ہے جو ان کے استقبال کے لیے بے قرار ہے۔ اس اعتبار سے بھی یہ ایمان بالقدر کا عقیدہ ہمارے لیے بہت سکون اور راحت کا باعث ہے۔ اس کو اقبال نے بڑے پیارے انداز میں بیان کیا ہے ؎

بروں کشید ز پیچاکِ ہست و بود مرا
چہ عقدہ ہا کہ مقامِ رضا کشود مرا!

یعنی اللہ کی رضا پر راضی رہنے نے مجھے کیسی کیسی الجھنوں سے نجات دے دی ہے۔ وہ پیچ وتاب اور frustration' اندر ہی اندر کا غصہ اور صدمہ' وہ مایوسی اور بددلی' وہ خوف اور اندیشے کہ یہ نہ ہو جائے وہ نہ ہو جائے' ان سب الجھنوں سے ایمان بالقدر کے عقیدے نے مجھے نجات دلا دی اور مجھے یہ یقین ہو گیا کہ کچھ بھی نہیں ہو سکتا' ایک پتا تک نہیں ہل سکتا جب تک کہ اذنِ ربی نہ ہو۔ اور میرے رب نے جو بات میرے لیے لکھ دی ہے مجھے اس پر کوئی رنج اور افسوس نہیں ؎

نشانِ مردِ مؤمن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لب اوست!

اعمال کا دارومدار خاتمے پر ہے!

اب ایمان بالقدر سے متعلق جو آخری سبق ہے وہ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ اربعین نووی کی زیر مطالعہ حدیث کے آخر میں جو یہ کہا گیا ہے:

((فَوَ اللّٰهِ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ غَیْرُهٗ ! اِنَّ اَحَدَكُمْ لَیَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ حَتّٰی

مَا يَكُوْنُ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهَا اِلَّا ذِرَاعٌ ' فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ' فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ' فَيَدْخُلُهَا ' وَاِنَّ اَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ ' حَتّٰى مَا يَكُوْنُ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهَا اِلَّا ذِرَاعٌ' فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ' فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ' فَيَدْخُلُهَا))

''تم میں سے کوئی آدمی اہل جنت کے سے اعمال کرتا رہتا ہے' یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے مابین صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ باقی رہ جاتا ہے تو اس پر وہ سابقہ تحریر غالب آ جاتی ہے اور وہ شخص اہلِ جہنم کا سا عمل کر کے جہنم میں چلا جاتا ہے' اور ایک شخص اہلِ جہنم کے سے عمل کرتا رہتا ہے' یہاں تک کہ اس کے اور جہنم کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ باقی رہ جاتا ہے تو اس پر وہ سابقہ تحریر غالب آ جاتی ہے اور وہ شخص اہلِ جنت کا سا عمل کر کے جنت میں چلا جاتا ہے۔''

اس کی توجیہہ یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص نے اپنے اوپر ایک مصنوعی لبادہ اوڑھا ہوا ہو جبکہ اُس کی اصل سرشت کچھ اور ہو۔ جیسے سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾﴾ (البقرۃ)

''اور لوگوں میں سے کوئی شخص ایسا بھی ہے جس کی باتیں تمہیں بڑی اچھی لگتی ہیں دنیا کی زندگی میں اور وہ اللہ کو بھی گواہ ٹھہراتا ہے اپنے دل کی بات پر' حالانکہ فی الواقع وہ شدید ترین دشمن ہے۔ اور جب وہ پیٹھ پھیر کر جاتا ہے تو زمین میں بھاگ دوڑ کرتا ہے تاکہ اس میں فساد مچائے اور کھیتی اور نسل کو برباد کرے۔ اور اللہ تعالیٰ کو فساد بالکل پسند نہیں ہے۔''

یعنی اعمال فساد مچانے والوں جیسے ہیں لیکن اوپر جو لبادہ ہے وہ نیکوکاروں کا ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ وہ لبادہ اتر جاتا ہے اور وہ بالکل عریاں ہو جاتا ہے' اس کی اصل اندرونی شخصیت سامنے آ جاتی ہے۔ زیر درس حدیث کے اس آخری حصے کا معاملہ بھی بالکل اسی طرح کا ہے۔ ایک شخص اپنے شاکلہ کے اندر رہتے ہوئے نیکی کی جدوجہد کر رہا ہے' اپنی سی کوشش کر رہا ہے' لیکن اسے کامیابی حاصل نہیں ہو رہی ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ دیکھنے والوں کو یہی نظر آئے گا کہ وہ جہنمیوں کے سے اعمال کر رہا ہے' حتیٰ کہ اس کی شخصیت کے

اندر حق کا غلبہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنی اس اندرونی کشمکش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ اندرونی کشمکش ہر شخص کے اندر ہوتی ہے' آپ کے اندر بھی ہے اور میرے اندر بھی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے اندر قلب یعنی دل بھی ہے' روح بھی ہے' ضمیر (conscience) بھی ہے' نفس امارہ بھی ہے' نفس مطمئنہ بھی ہے' Libido بھی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ حیوانی جبلت (instincts) بھی ہے۔ ان سب میں ہر وقت کشمکش جاری رہتی ہے۔ اب اگر ایک شخص موت سے پہلے کسی مرحلے پر اس کشمکش میں کامیاب ہو کر ٹھیک راستے پر آ جاتا ہے تو آخری وقت کے اعمال کے مطابق اس کا فیصلہ ہوگا۔ اس لیے کہ یہ اسلامی ضابطہ ہے کہ جن اعمال پر انسان کا خاتمہ ہوگا فیصلہ بھی اسی کے اعتبار سے ہو گا۔ اس حوالے سے حدیث کے الفاظ ملاحظہ ہوں: ((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيْمِ))(۱)

''بے شک اعمال (اور فیصلہ) کا دارومدار خاتمے کے اعتبار سے ہوگا۔''

علاج معالجہ ایمان بالقدر کے منافی نہیں!

تقدیر کے معاملہ میں ایک مسئلہ اور بھی ہے جو درج ذیل حدیث سے سمجھ میں آ جائے گا۔ حضرت ابوخزامہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: اَرَاَيْتَ رُقًى نَسْتَرْقِيْهَا وَدَوَاءً نَتَدَاوٰى بِهٖ وَتُقَاةً نَتَّقِيْهَا هَلْ تَرُدُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ شَيْئًا؟ ''اے اللہ کے رسول! ہم اپنی بیماری پر جھاڑ پھونک کراتے ہیں (اُس وقت تک شاید اس کی ممانعت نہ آئی ہو) یا کوئی دوا کھاتے ہیں یا یہ کہ ہم کسی شے کے شر سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں' تو کیا اس سے اللہ کی تقدیر میں کوئی فرق واقع ہوتا ہے؟'' اُس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((هِيَ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ))(۲)

''یہ (ساری چیزیں بھی) اللہ کی اس قدر (اندازہ) میں شامل ہیں''۔ یعنی یہ بھی اللہ کے علم میں ہے کہ یہ شخص بیمار ہوگا تو علاج کرانے سے ٹھیک ہو جائے گا۔ اس لیے یہ سب بھی اس تقدیر الٰہی کا حصہ ہیں۔

اقول قولی هذا واستغفر اللّٰه لی ولکم ولسائر المُسلمین والمُسلمات

(مرتب: حافظ محمد زاہد' ادارتی معاون)

(۱) صحیح البخاری' کتاب القدر' باب العمل بالخواتیم۔

(۲) سنن الترمذی' کتاب الطب' باب ما جاء فی الرقی والادویۃ۔

اسلام میں تصورِ فلاح کی دو اہم بنیادیں

ایمان اور عملِ صالح

عتیق الرحمٰن صدیقی

قرآن حکیم نے سورۃ العصر میں فلاح و خسران کے تصور کو دو ٹوک انداز میں واضح فرما دیا ہے:

﴿وَالْعَصْرِ ① اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ② اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ③﴾ (العصر)

''زمانے کی قسم' انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے' سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرتے رہے اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔''

گویا خسارے اور نقصان سے وہی لوگ بچیں گے جو چار صفات سے متّصف ہوں گے۔ ایمان' عمل صالح' توصیت حق اور توصیت صبر —— اس تحریر میں پہلی دو صفات ایمان اور عمل صالح کا ذکر کیا جائے گا۔ خسارے سے محفوظ و مصئون رہنے کے لیے پہلی اہم خصوصیت ایمان ہے۔

ایمان

لغوی اعتبار سے ایمان کی اصل ''امن'' ہے جو قرآن میں مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ آمنه ای اعطاه امنا یعنی اس کو امن دیا۔ قرآن میں سورۃ القریش میں فرمایا گیا: ﴿وَاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ④﴾ ''اور ان کو خوف سے امان دی''۔ آمن له صدّقه واعتمد علیه ''اس کی تصدیق کی اور اس پر اعتماد کیا''۔ آمن به ایقن به ''اس کا یقین کیا''۔ کتاب اللہ میں یہ لفظ ان تمام طریقوں سے مستعمل ہے۔ ''مؤمن'' کا لفظ اس کے مشتقات میں سے ہے اور اللہ کے اسمائے حسنیٰ میں بھی شامل ہے۔ ''آمین'' جو تصدیق و اعتماد کا کلمہ ہے' وہ بھی اسی مادہ سے ماخوذ ہے۔ پس وہ یقین جو خشیت' توکّل اور اعتقاد کے تمام لوازم و شرائط کے ساتھ پایا

جائے ایمان ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر' اس کی آیات پر' اس کے احکام پر ایمان لائے' اپنا سب کچھ اس کو سونپ دے' اس کے فیصلوں پر راضی ہو جائے وہ مؤمن ہے۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ ایمانِ حقیقی کا مفہوم واضح کرنے کی بحث کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''ایمان ایک نفسانی و روحانی حالت کا نام ہے جو انسان کے تمام عقائد و اعمال پر حاوی ہے۔ وہ جس طرح علوم سے بڑھتی ہے اسی طرح اعمال سے بھی اس میں زیادتی ہوتی ہے۔ اس کے دو رُکن ہیں ایک علم اور دوسرا عمل۔ ان میں سے ایک کو بھی ڈھا دو گے اس کی پوری عمارت ڈھے جائے گی۔'' (مجموعہ تفسیر فراہی)

ایمان کا لفظ قرآن حکیم میں محض زبانی اقرار کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ سورۃ النساء میں فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ یَكُنِ اللّٰهُ لِیَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِیَهْدِیَهُمْ سَبِیْلًا ﴿۱۳۷﴾﴾

''رہے وہ لوگ جو ایمان لائے پھر کفر کیا' پھر ایمان لائے پھر کفر کیا' پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے تو اللہ ہرگز ان کو معاف نہ کرے گا اور نہ کبھی ان کو راہِ راست دکھائے گا۔''

گویا یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے دین ایک غیر سنجیدہ تفریح اور کھلونا ہے۔ جب فضائے دماغی میں ایک لہر اٹھی تو مسلمان ہو گئے اور جب دوسری لہر اٹھی تو کافر بن گئے۔ ان کا ایمان زبانی اقرار تک محدود ہے۔ یہ معبودِ منفعت کے غلام ہیں۔ سورۃ المائدۃ میں فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗۤ ﴾ (آیت ۵۴)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ اور بہت سے لوگ پیدا کر دے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہوگا۔''

سورۃ الانفال میں فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۷﴾﴾

''اے اہل ایمان! مت خیانت کرو اللہ سے اور رسول (ﷺ) سے اور نہ ہی اپنی (آپس کی) امانتوں میں خیانت کرو جانتے بوجھتے۔''

سورۃ التوبہ میں فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِیْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِیْلٌ ﴿۳۸﴾﴾

''اے ایمان کے دعویدارو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ نکلو اللہ کی راہ میں تو تم دھنسے جاتے ہو زمین کی طرف؟ (سوچو!) کیا تم نے آخرت کی بجائے دنیا کی زندگی کو قبول کر لیا ہے؟ تو (جان لو کہ) دنیا کی زندگی کا ساز و سامان آخرت کے مقابلے میں بہت قلیل ہے۔''

اس آیت کے ضمن میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ فرماتے ہیں:

''قرآن حکیم میں منافقین سے خطاب 'یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' کے صیغے میں ہی ہوتا ہے' کیونکہ ایمان کا دعویٰ تو وہ بھی کرتے تھے اور قانونی اور ظاہری طور پر وہ بھی مسلمان تھے۔'' (بیان القرآن' حصہ سوم' ص ۲۵۸)

دراصل قرآن مجید میں جس ایمان کا تقاضا کیا گیا ہے وہ قانونی نہیں حقیقی ایمان ہے جس کا تعلق دل سے ہے' گویا ایمان قلب سے تعلق رکھنے والی اور محبت کو جوش دلانے والی چیز ہے۔ سورۃ المجادلہ میں فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ وَاَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ﴾ (آیت ۲۲) ''وہی لوگ ہیں کہ (اللہ نے) ان کے دلوں میں ایمان لکھ دیا اور ان کی اپنی طرف سے روح سے تائید کی''۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا: ﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۱۶۵) ''اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت رکھتے ہیں''۔ قرآن حکیم میں دوسرے متعدد مقامات پر سچے دل سے ماننے اور یقین کرنے کو ہی ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۃ الحجرات میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا﴾ (آیت ۱۵) ''مؤمن تو حقیقت میں وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر شک میں نہ پڑے''۔ سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾ (آیت ۳۰) ''جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر ڈٹ گئے''۔ سورۃ الانفال میں فرمایا: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ (آیت ۲) ''مؤمن تو حقیقت میں وہ ہیں کہ جب (ان کے سامنے) اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل لرز جاتے ہیں''۔ سورۃ النساء میں اہل ایمان کی خصوصیت یوں واضح کی گئی:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى یُحَكِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا

فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ﴿۶۵﴾﴾

''پس نہیں (اے نبی ﷺ!) آپ کے رب کی قسم! وہ ہرگز مؤمن نہیں ہیں جب تک کہ اپنے باہمی اختلاف میں آپ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں' پھر جو کچھ آپ فیصلہ کریں اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔''

اسی سورۃ النساء میں زبانی اقرار یعنی قانونی ایمان اور حقیقی ایمان کا فرق واضح کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ مطلوب حقیقی ایمان ہے' نہ کہ زبانی اقرار۔ فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ (آیت ۱۳۶) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسول (ﷺ) پر''۔ صرف زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہہ دینے سے بات نہیں بنتی' اس لیے جا بجا عمل کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ آزمائشوں کی بھٹی سے گزر کر ہی یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مؤمن کون ہے اور فاسق کون! سورۃ العنکبوت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ﴿۲﴾ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِیْنَ ﴿۳﴾﴾

''کیا لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ یہ کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور وہ آزمائشوں میں نہ ڈالے جائیں گے۔ اور بے شک ہم نے آزمایا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے تھے' پس اللہ معلوم کر کے رہے گا ان لوگوں کو جو سچے ہیں اور معلوم کر کے رہے گا ان لوگوں کو جو جھوٹے ہیں۔''

قبل ازیں ایمان کے لغوی مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بتایا گیا تھا کہ آمَنَ کے معنی اَیْقَنَ بھی ہیں' یعنی یقین اور ایقان۔ قرآن مجید میں ایمان کو اس معنی میں استعمال کرتے ہوئے ہمیشہ صیغہ فعل استعمال کیا گیا ہے اور ایمان کے متعلقات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ البقرۃ' آیت ۲۸۵ میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۫ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۫ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؗ﴾

''ایمان لایا (یقین کیا) رسول اُس چیز پر جو اس پر اُتاری گئی اُس کے رب کی جانب سے اور مؤمنین بھی۔ ہر ایک ایمان لایا اللہ پر' اُس کے فرشتوں پر' اُس کی کتابوں پر' اور اُس کے رسولوں پر (اور کہا کہ) ہم اللہ کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور کہا (صمیم قلب سے کہ) ہم نے سنا اور اطاعت کی۔''

اس سے قبل سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ میں بھی ایمان کے اجزاء کو بیان کیا گیا ہے کہ کن چیزوں پر ایمان لانا لازمی اور ضروری ہے۔ اللہ پر ایمان لانا' اسے وحدہٗ لاشریک تسلیم کرنا' اس کو حاکم حقیقی ماننا اور اس کے احکام کی اطاعت اور جن باتوں سے اس نے روکا ہے ان سے رک جانا ایمان کی اساس ہے۔ اسی طرح ایمان بالرسالت' ایمان بالآخرت' ایمان بالملائکہ اور ایمان بالکتب ایمان کے بنیادی اجزاء ہیں۔

عملِ صالح

ایمان کے بعد دوسری اہم صفت جو فلاح و کامرانی کی ضمانت فراہم کرتی ہے اور خسران سے تحفظ دیتی ہے' عمل صالح ہے۔ **عملوا الصّٰلحٰت** ایک ایسا جامع کلمہ ہے جس میں تمام اعمال حسنہ سمٹ آئے ہیں۔ قرآن حکیم نے اعمالِ حسنہ کو صٰلحٰت سے تعبیر کیا ہے اور یہ لفظ تمام نیکیوں کا جامع ہے۔ کوئی بھی عمل اس وقت تک صالح نہیں ہوسکتا جب تک اس کی جڑ میں ایمان موجود نہ ہو۔ انسان کے لیے زندگی اور نشوونما کا سبب عمل صالح ہی ہے اور یہی انسان کی ظاہری و باطنی' شخصی و اجتماعی صلاح و ترقی کا ذریعہ ہے اور اسے اعلیٰ مدارج تک پہنچانے کا سبب ہے۔ قرآن مجید میں کسی مقام پر بھی ایمان کے بغیر کسی عمل کو صالح نہیں کہا گیا۔ انسان کے مقصد وجود کی تکمیل اسی وقت ممکن ہے جب اس کو عطا کردہ صلاحیتیں فطری انداز میں پروان چڑھیں۔ قرآن نے فرمایا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝۵۶﴾ (الذّٰریٰت) ''اور میں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں''۔ یہاں عبادت سے اطاعت الٰہی مراد ہے اور اطاعت اعمالِ صالحہ سے نمو پاتی ہے۔ جو اعمال اس قادر و قدیر کی حکمت و تدبیر کے موافق ہوں گے' اس کی مرضی و منشا کی تکمیل کر رہے ہوں گے وہ اعمالِ حسنہ کہلائیں گے۔ قرآن اس امر کی تصریح کرتا ہے کہ انسان کی ترقی عمل صالح پر مبنی ہے۔ سورۂ فاطر میں ارشاد ہے:

﴿اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ۭ وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۭ وَمَكْرُ اُولٰۗىِٕكَ هُوَ يَبُوْرُ ۝۱۰﴾

''اس کی طرف عروج پاتا ہے کلام طیب اور عمل صالح اس کو رفعت بخشتا ہے (انسان کا یہ عروج عمل صالح اور اس اعلیٰ مقصد کا نتیجہ ہے جو اس کائنات کی خلقت کا منشا ہے)۔ اور جو لوگ برائی کی سازشیں کرتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے' اور ان لوگوں کی تدبیر نامراد ہوگی۔''

اس لیے کہ بری تدبیریں اس حق کے خلاف ہیں جو کائنات کی اصل روح ہے' چنانچہ جو کوشش اس کو مٹانے کے لیے ہوگی اللہ تعالیٰ اس کو فروغ نہ دے گا' کیونکہ اس کائنات کی تخلیق کا منشا در حقیقت ایک عظیم الشان حکمت ہے جس کا نام قرآن مجید کی اصطلاح میں ''حق'' ہے۔

اسلام کے اساسی اصولوں پر مکمل یقین کرنے کا نام ''ایمان'' ہے' اور عمل صالح یہ ہے کہ ان اصولوں کے مطابق اخلاص اور محبت کے ساتھ عمل کیا جائے۔ تنہا علم و یقین کفایت نہیں کرتا جب تک کہ اسے عمل کے سانچے میں ڈھال نہ دیا جائے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت سے یکساں اہمیت کے حامل ہیں' ان کا باہم چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہمارا المیہ یہ رہا ہے کہ ہم جتنا ایمان کو اہمیت دیتے ہیں' عمل صالح کو وہ درجہ نہیں دیتے' جس کے نتیجے میں ہماری زندگیوں میں بے شمار خلا موجود ہیں۔ ہم اگر کلام مبین کی تعلیمات کو صحیح معنوں میں پیش نظر رکھیں اور ان کی روشنی میں تعلیم و تبلیغ اور تلقین اور تبشیر و تنذیر کا تسلسل قائم کریں تو صورت حال میں بآسانی تغیر رونما ہوسکتا ہے۔ تاریخ کے نظائر ہمارے سامنے ہیں کہ ہمیشہ ان ہی قوموں اور افراد پر کامیابی کے دروازے کھلے ہیں جو نہ صرف علم و یقین کی دولت سے معمور تھے بلکہ ان کے اعمال بھی حسین و خوش نما تھے۔ سورۃ التین میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝۴ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝۵ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝۶﴾

''ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ پھر اسے الٹا پھیر کر ہم نے سب نیچوں سے نیچ کر دیا۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے کہ ان کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔''

فطرتِ صحیحہ کی روش اپناتے ہوئے وہ احسن تقویم کے شرف سے نوازا جاتا ہے اور جب اس فطرت کو مسخ کرنے کا انداز اپناتا ہے اور جسم و ذہن کی طاقتوں کو برائی کے راستے میں استعمال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے برائی ہی کی توفیق دیتا ہے اور گراتے گراتے اسے گراوٹ کی اس انتہا تک پہنچا دیتا ہے کہ کوئی مخلوق گراوٹ کی اس انتہا تک نہیں پہنچی ہوتی۔ بچتے وہی لوگ ہیں جو ایمان کی رفعت اور عمل صالح کی بلندی سے بہرہ ور ہو کر رہیں۔

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ﴾ (البقرۃ:۸۲)

''اور جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے وہی جنت والے ہیں۔''

گویا جنت کا حصول نسل اور قومیت سے مستلزم نہیں بلکہ اس کا انحصار ایمان اور عمل صالح پر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کتاب حکیم میں متعدد مقامات پر اس امر کی تصریح فرمائی ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰی مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾ (المائدۃ)

''بے شک جو مسلمان ہیں اور جو یہود ہیں اور صائبین و نصاریٰ' جو کوئی اللہ پر اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے نہ تو ان پر ڈر ہے اور نہ وہ غم کھائیں گے۔''

واضح رہے کہ قرآن حکیم کے دوسرے مقامات سے اس امر کی صراحت ملتی ہے کہ اللہ پر ایمان اور یوم آخر پر ایمان کے علاوہ وقت کے نبی پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔

اس آیۂ کریمہ کا منشا بھی یہ ہے کہ نجات کا حصول صرف کسی مذہب وملت سے نسبت پر نہیں بلکہ اللہ کے احکامات پر یقین کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے میں ہے۔ ایمان نہ لانے اور اعمال سیئہ کے اختیار کرنے میں تباہی اور ہلاکت ہے اور نیکوکاری کے نتیجے میں دین و دنیا کی بھلائی مضمر ہے۔ اسی تناظر میں ذوالقرنین کی زبانی یہ فرمایا گیا:

﴿قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ یُرَدُّ اِلٰی رَبِّهٖ فَیُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ۝ وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ نِ الْحُسْنٰی﴾ (الکہف)

''اس نے کہا جو کوئی گناہ کا کام کرے گا تو ہم اس کو (دنیا میں) سزا دیں گے پھر وہ اپنے ربّ کے پاس لوٹ کر جائے گا تو وہ اس کو بری سزا دے گا۔ اور جو کوئی ایمان لایا اور نیک عمل کیے تو اس کے لیے اچھا بدلہ ہے۔''

سورۃ الانبیاء میں فرمایا:

﴿فَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْیِهٖ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ﴾

''تو جو کوئی نیک عمل کرے اور وہ مؤمن بھی ہو تو اس کی کوشش اکارت نہ ہوگی' اور ہم اس (کے نیک عمل) کو لکھتے جاتے ہیں۔''

معلوم ہوا کہ جنت کا استحقاق دراصل انہی لوگوں کو ہے جو ایمان کے مطابق عمل سے آراستہ رہیں۔ سورۃ الکہف میں ربّ کریم نے فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا﴾

''بے شک جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان کی مہمانی کے لیے باغ فردوس ہیں۔''

آگے مزید فرمایا:

﴿فَمَنْ كَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْیَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا یُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا﴾

''تو جس کو اپنے پروردگار سے ملنے کی امید ہو تو چاہیے کہ وہ نیک عمل کرے اور کسی کو اپنے پروردگار کا شریک نہ بنائے۔''

ایمان قوی' مضبوط اور مستحکم ہو تو عملی پہلو ہو بہو اس کا عکاس ہوتا ہے اور اگر ایمان کمزور و ضعیف ہو تو عمل کی نوعیت بھی اس سے مختلف نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ تنہا ایمان اور تنہا عمل کو نجات کا ذریعہ نہیں گردانا گیا۔ سورۃ الحج میں فرمایا:

﴿فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ﴾

''تو جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے وہ آرام کے باغوں میں ہوں گے۔''

قرآن حکیم میں تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ ۴۵ مواقع پر یہ الفاظ موجود ہیں: ﴿الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ''جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے''۔ واضح ہوا کہ فوز و فلاح کا مدار ایمان اور عمل صالح دونوں پر ہے' البتہ مدارج کے اعتبار سے ایمان مقدم ہے اور عمل کا درجہ اس سے ملحق ہے۔ قوت و اقتدار کا حصول بھی انہی کا ہے جو ایمان اور عمل صالح دونوں سے مشرف ہوں۔ سورۃ النور میں فرمایا:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ﴾ (آیت ۵۵)

''تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے اللہ نے وعدہ کیا کہ ان کو زمین میں خلافت عطا کرے گا۔''

سورۃ الفتح میں فرمایا:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا﴾

''اللہ نے ان میں سے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے بخشش اور بڑے اجر کا وعدہ کیا۔''

اسلام کے تصورِ فلاح و خسران کو کلام مبین میں کئی مقامات پر صراحت کے ساتھ مبرہن کیا گیا ہے۔ سورۃ المؤمنون میں فرمایا:

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝۲ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝۳ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝۴ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝۵ ..... وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝۸ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ۝۹ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝۱۰ الَّذِیْنَ

يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ⑪﴾

”یقیناً فلاح پائی ہے ایمان والوں نے‘ جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں‘ لغویات سے دُور رہتے ہیں‘ زکوٰۃ کے طریقے پر عامل ہوتے ہیں‘ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں ...... اپنی امانتوں اور عہد کا پاس کرتے ہیں‘ اور اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو وارث ہیں‘ جو میراث میں فردوس پائیں گے‘ اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“

سورۃ الاعلیٰ میں فرمایا:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ⑭ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ⑮ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ⑯ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ⑰﴾

”فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی‘ اور اپنے ربّ کا نام یاد کیا پھر نماز پڑھی۔ مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو‘ حالانکہ آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے۔“

صاحبِ تفہیم القرآن لکھتے ہیں کہ سورۃ المؤمنون کی ابتدائی آیات میں چار اہم مضامین بیان ہوئے ہیں:

”اوّل یہ کہ جو لوگ بھی قرآن مجید اور محمد (ﷺ) کی بات مان کر یہ اوصاف اپنے اندر پیدا کر لیں گے اور اس رویے کے پابند ہو جائیں گے وہ دنیا و آخرت میں فلاح پائیں گے قطع نظر اس سے کہ کسی قوم‘ نسل یا ملک سے ہوں۔ دوم یہ کہ فلاح محض اقرارِ ایمان یا محض اخلاق اور عمل کی خوبیوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ دونوں کے اجتماع کا نتیجہ ہے۔ جب آدمی اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت کو مانے پھر اس کے مطابق اخلاق اور عمل کی خوبیاں اپنے اندر پیدا کرے تب وہ فلاح سے ہمکنار ہو گا۔ سوم یہ کہ فلاح محض دنیوی اور مادی خوشحالی اور محدود وقتی کامیابیوں کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک وسیع تر حالت خیر کا نام ہے جس کا اطلاق دنیا اور آخرت میں پائیدار و مستقل کامیابی و آسودگی پر ہوتا ہے۔ یہ چیز ایمان اور عمل صالح کے بغیر نصیب نہیں ہوتی۔ اس کلیے کو نہ تو گمراہوں کی وقتی خوشحالیاں اور کامیابیاں توڑتی ہیں نہ مؤمنین و صالحین کے عارضی مصائب کو اس کی نقیض ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ چہارم یہ کہ مؤمنین کے ان اوصاف کو نبی ﷺ کے مشن کی صداقت کے لیے دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔“

آخر میں اس ضمن میں حضور نبی کریم ﷺ کے چند ارشادات بیان کیے جاتے ہیں۔

حضرت سفیان بن عبداللہ ؓ کہتے ہیں میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! مجھے اسلام کے

سلسلہ میں ایک ایسی بات کی تلقین فرمائیے کہ میں آپ کے بعد کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

((قُلْ آمَنْتُ بِاللّٰهِ فَاسْتَقِمْ)) (۱)

”کہو میں اللہ پر ایمان لایا پھر (مضبوطی کے ساتھ اپنے اس مسلک پر) جم جاؤ۔“

یعنی یہ تسلیم کرو کہ اللہ ہی تنہا اس کائنات کا مالک‘ معبود اور ہمہ مقتدر ہے اور میں اسی کے احکامات کی پیروی کروں گا‘ مرتے دم تک نظریۂ توحید سے انحراف نہ کروں گا‘ اور صرف اسی کی اطاعت میں سرگرم عمل رہوں گا۔ ایمانِ کامل کی علامت بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ)) (۲)

”اس شخص کے کامل ایمان ہونے میں کوئی شبہ نہیں جس کی دوستی اور دشمنی اللہ کے لیے ہو اور جو مال خرچ کرنے اور نہ کرنے میں اللہ کی رضا کو ملحوظ رکھتا ہو۔“

گویا اللہ کی رضا کا حصول مؤمن کا نصب العین ہوتا ہے‘ وہ صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے کسی سے جڑتا ہے اور کسی سے کٹتا ہے۔ ایک حدیث میں ایمان کو صبر اور سماحت سے موسوم کیا گیا ہے۔ حلاوتِ ایمان کے حصول کے ضمن میں فرمایا:

((ذَاقَ طَعْمَ الْاِيْمَانِ مَنْ رَضِيَ بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلًا)) (۳)

”ایمان کا مزہ چکھا اس شخص نے جو اللہ کو اپنا رب مان کر اور اسلام کو اپنا دین مان کر اور محمد ﷺ کو اپنا رسول تسلیم کرنے پر راضی ہو گیا۔“

گویا ایمان کی مٹھاس سے وہی شخص لطف اندوز ہو گا جس نے اللہ کی بندگی اختیار کر لی اور اپنے آپ کو نبی مکرم ﷺ کی رہنمائی میں دے دیا اور یہ عزم کر لیا کہ اس نے ہر حال میں انہی نقوشِ راہ کو سنگ میل بنانا ہے جو اس کے لیے اس کے مالک نے متعین کیے ہیں۔

---

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب جامع اوصاف الاسلام۔

(۲) سنن ابی داوٗد‘ کتاب السنۃ‘ باب الدلیل علی زیادۃ الایمان ونقصانہ۔

(۳) صحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب الدلیل علی من رضی باللّٰہ ربا ......

اخذ واستفادہ

☆تفہیم القرآن ☆ مجموعہ تفاسیر فراہی ☆ سیرت النبی ﷺ جلد پنجم ☆ راہِ عمل ☆ ترجمان الحدیث‘ حصہ اول

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی امتیازی آراء (۲)

انجینئر نوید احمد

(۵) تحریکاتِ اسلامیہ کی ناکامی کے اسباب کی درست تشخیص

بیسویں صدی عیسوی میں اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لیے مختلف ممالک میں کئی احیائی تحریکیں سرگرم ہوئیں لیکن تا حال کوئی بھی تحریک کامیابی حاصل نہ کرسکی۔ غلبۂ دین کی جِدّوجُہد کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے' لہٰذا تجزیہ کرنا چاہیے کہ آخر وہ کیا سبب تھا جس کی وجہ سے کمی رہ گئی اور یہ تحریکیں ناکام ہوگئیں۔ ماضی کی کوتاہیوں سے سبق حاصل کرکے ہی آئندہ کے لیے درست منصوبہ بندی کی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے تحریکوں کی ناکامی کے سبب کی تشخیص اس طرح کی:

''ان تحریکوں کی ناکامی کا سبب بظاہر تو یہ ہے کہ انہوں نے بے صبری سے کام لیا اور اپنے اپنے ملکوں میں سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی معتد بہ تعداد کے ذہنوں کو بدلے بغیر سیاست کے میدان میں قدم رکھ دیا' جس کے نتیجے میں قومی قیادتوں اور ترقی پسند عناصر سے قبل از وقت تصادم کی نوبت آ گئی' لیکن درحقیقت ان کی ناکامی براہِ راست نتیجہ ہے ان کے تصورِ دین کی خامی اور مطالعہ اسلام کے نقص کا۔''(۴۰)

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں آگاہ فرمایا کہ مسلمان اُسی صورت میں غالب ہوں گے اگر وہ واقعی مؤمن ہوں:

﴿ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ (آلِ عمران)

''اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم مؤمن ہو۔''

قرآن کے اسی فرمان کو ملحوظ رکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحبؒ احیائی تحریکوں کے تصورِ دین کی خامی اور مطالعہ اسلام کے نقص کو یوں واضح کرتے ہیں:

''ذرا دقت نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تحریکوں کا مطالعۂ اسلام اسی

مغربی نقطۂ نظر پر مبنی ہے جس میں روح پر مادے اور حیاتِ اُخروی پر حیاتِ دُنیوی کو فوقیت حاصل ہے۔ چنانچہ اسلام کے ان ماوراء الطبیعیاتی اعتقادات کا اقرار تو ان کے یہاں موجود ہے جن کے مجموعے کا نام ایمان ہے' لیکن انہیں کچھ درخورِ اعتناء اور لائق التفات نہیں سمجھا گیا اور نگاہیں کلیۃً اس ہدایت و رہنمائی پر مرکوز ہیں جو حیاتِ دُنیوی کے مختلف شعبوں کے لیے اسلام نے دی ہیں اور جن کے مجموعے کا نام 'اسلامی نظامِ زندگی' رکھا گیا ہے۔''(۴۱)

ڈاکٹر صاحبؒ نے احیائی تحریکوں کی اس خامی کو بیان کیا ہے کہ اُن کے یہاں اسلام کے ان ماوراء الطبیعیاتی اعتقادات کا اقرار تو موجود ہے جن کے مجموعے کا نام ایمان ہے لیکن انہیں کچھ لائق التفات نہیں سمجھا گیا۔ اس نکتہ کی وضاحت ڈاکٹر صاحبؒ یوں کرتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کی ہستی کا اقرار تو موجود ہے لیکن ایمان باللہ کی وہ کیفیت کہ آفاق و انفس میں تنہا وہی فاعل مطلق' مؤثر حقیقی اور مسبّب الاسباب نظر آنے لگے' بالکل مفقود ہے۔ آخرت کا اقرار تو کیا جاتا ہے لیکن اس پر ایسا ایمان کہ ''كُنْ فِي الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ'' کی کیفیت پیدا ہو جائے' قطعاً ناپید ہے۔ رسالت کا اقرار تو ہے لیکن محبتِ رسولؐ نام کو موجود نہیں اور مقامِ رسالت کا تصور زیادہ تر ترقی پسند لوگوں کے نزدیک تو ڈاک کے ہرکارے اور صرف اپنی زندگی میں ملت کے مرکز یعنی رہبر و مطاع سے زیادہ نہیں' اور جو سنت کے مقام سے زیادہ آگاہ ہیں انہوں نے بھی سنت عادت اور سنتِ رسالت کی تقسیم سے ایسا چور دروازہ پیدا کرلیا ہے جس سے کم از کم اپنی نجی زندگیوں کی حد تک زمانے کا ساتھ دینے کی آزادی برقرار رہے! گویا ایمان کا وہ اقرار پایا جاتا ہے جو قانونی اسلام کی بنیاد ہے اور یہ کیفیت کہ ایمان انسان کا 'حال' بن جائے نہ صرف یہ کہ موجود نہیں ہے بلکہ اس کی کسی ضرورت و اہمیت کا احساس بھی سرے سے عنقا ہے!''(۴۲)

تجزیہ کے آخر میں ڈاکٹر صاحبؒ احیائی تحریکوں کے بارے میں تبصرہ کرتے ہیں:

''اس اعتبار سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں فی الواقع مذہبی سے زیادہ 'سیاسی و عمرانی' اور دینی سے زیادہ 'دنیوی' ہیں۔ اور آخری تجزیے میں دوسری سیاسی و معاشی تحریکوں سے صرف اس اعتبار سے مختلف ہیں کہ اُن کے نزدیک سرمایہ دارانہ جمہوریت یا اشتراکیت بہتر نظام ہائے حیات ہیں اور اِن کے نزدیک اسلام انسانی زندگی کے جملہ مسائل کو بہتر طور پر حل کرتا ہے — گویا درحقیقت مذہب کی اصل

اقدار کے احیاء کا کام تو ابھی شروع ہی نہیں ہوا۔

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روح شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی!

یہی سبب ہے کہ یہ تحریکیں بے لنگر کے جہازوں کے مانند اِدھر اُدھر بھٹک رہی ہیں اور ان کا حال اکثر و بیشتر اس مسافر کا سا ہے جسے نہ تو منزل ہی کا پتا رہا اور نہ یہ ہی یاد رہا کہ سفر شروع کہاں سے کیا تھا ؎

ہم تو فانی جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا''(۴۳)

ناکامیوں کا سبب بتانے کے بعد ڈاکٹر صاحبؒ نے کامیابی کے حصول کے لیے لائحہ عمل ان الفاظ میں بیان کیا:

''اسلام کی بنیاد ایمان پر ہے اور احیائے اسلام کا خواب ایمان کی عمومی تجدید کے بغیر کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ مسلمان ممالک کی سیاسی آزادی و خود اختیاری بھی یقیناً بہت اہم ہے اور اس سے بھی ایک حد تک اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی راہ ہموار ہوئی ہے' اسی طرح اسلامی نظام زندگی کا تصور اور اس پر ایک بہتر نظامِ حیات ہونے کے اعتبار سے اعتماد بھی ایک حد تک مفید اور قابل قدر ہے اور جن تحریکوں کے ذریعے یہ پیدا ہوا یا ہو رہا ہے ان کی سعی و جہد بھی احیائے اسلام ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ لیکن اصل اور اہم تر کام ابھی باقی ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ عالم اسلام کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگ اس امر کی جانب متوجہ ہوں اور جنہیں اس کی اہمیت کا احساس ہو جائے وہ اپنی تمام تر سعی و جہد کو اس پر مرکوز کر دیں کہ امت میں تجدید ایمان کی ایک عظیم تحریک برپا ہو اور ایمان نرے اقرار اور محض قال سے بڑھ کر 'حال' کی صورت اختیار کرے!''(۴۴)

(۶) اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لیے علمی و فکری کام کی وضاحت

ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ کے نزدیک احیائی تحریکوں کی ناکامی کا سبب یہ ہے کہ ایمانِ قلبی کے حصول اور اس میں اضافہ کی طرف کما حقہٗ توجہ نہیں دی گئی۔ لہٰذا اُن کی رائے میں اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لیے کرنے کا اہم ترین کام ہے ایمانِ قلبی کی بازیافت۔ اس حوالے سے ترجیح دینی ہوگی معاشرے کے اُن طبقات کو جو دانشور ہیں اور پورے معاشرے کو کسی راہ پر چلانے کی خداداد صلاحیت رکھتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر صاحبؒ:

''پھر یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اس قسم کے لوگ ہر دور اور ہر معاشرے کی وہ ذہین اقلیت (intellectual minority) ہوتے ہیں جو از خود معاشرے کی رہنمائی کے منصب پر فائز اور اجتماعیت کی پوری باگ ڈور پر قابض ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کی تبدیلی اور ان کے فکر و نظر کے انقلاب کو اولین اہمیت حاصل ہے—— اور اگر خدانخواستہ ایمان ان کے دلوں میں جاگزیں نہ ہو سکا اور انہیں جہالت و جاہلیت کی ظلمتوں سے نکالا نہ جا سکا تو صرف عوام الناس کے قلوب و اذہان کی تبدیلی سے کسی مؤثر اور پائیدار تبدیلی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔''(۴۵)

''بنا بریں وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ایک زبردست علمی تحریک ایسی اٹھے جو سوسائٹی کے اعلیٰ ترین طبقات یعنی معاشرے کے ذہین ترین عناصر کے فکر و نظر میں انقلاب برپا کر دے—— اور انہیں مادیت و الحاد کے اندھیروں سے نکال کر ایمان و یقین کی روشنی میں لے آئے اور خدا پرستی و خود شناسی کی دولت سے مالا مال کر دے۔ خالص علمی سطح پر اسلامی اعتقادات کے مدلل اثبات اور الحاد و مادہ پرستی کے پُر زور ابطال کے بغیر اس مہم کا سر ہونا محال ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ چونکہ موجودہ دور میں فاصلے بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں اور پوری نوعِ انسانی ایک کنبے کی حیثیت اختیار کر چکی ہے لہٰذا علمی سطح کا تعین کسی ایک ملک کے اعتبار سے نہیں بلکہ پوری دنیا کے اعلیٰ ترین معیار کے مطابق کرنا ہوگا—— اور اگرچہ یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ کام انتہائی کٹھن اور سخت محنت طلب ہے لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس کے بغیر اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے خواب دیکھنا جنت الحمقاء میں رہنے کے مترادف ہے۔''(۴۶)

مذکورہ بالا علمی کام کرنے کے لیے کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے؟ اِس سوال کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

''پیش نظر علمی تحریک کے لیے سب سے پہلے ایسے ذہین اور باصلاحیت نوجوانوں کو تلاش کرنا ہوگا جن میں علم کی ایک شدید پیاس فطری طور پر موجود ہو' جن کے قلوب مضطرب اور روحیں بے چین ہوں' جن کو خود اپنے اندر یہ احساس موجود نظر آئے کہ اصل حقیقت حواس کی سرحدوں سے بہت پرے واقع ہے اور جن میں حقیقت کی تلاش و دریافت کا داعیہ اتنا شدید ہو جائے کہ وہ اس کے لیے زندگیاں وقف کرنے کو تیار ہوں اور آرام و آسائش کے حصول اور خوشنما مستقبل (careers) کی تعمیر سے یکسر بے نیاز ہو جائیں۔''(۴۷)

مطلوبہ علمی کام کے لیے نوجوانوں کو کیا کرنا ہوگا؟ اس حوالے سے ڈاکٹر صاحب بیان

کرتے ہیں:

''ایسے نوجوانوں کو اولاً انسان کی آج تک کی سوچ بچار کا مکمل جائزہ لینا ہوگا' اور اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ انسانی فکر کی پوری تاریخ کا گہرا مطالعہ کریں۔ اس اعتبار سے منطق' ماوراء الطبیعیات' نفسیات' اخلاقیات اور روحانیات ان کے مطالعہ اور غور و فکر کا اصل میدان ہوں گے۔ (اگرچہ ضمنی طور پر عمرانیات اور طبیعیات کی ضروری معلومات کی تحصیل بھی ناگزیر ہوگی) فکر انسانی کے اس گہرے اور تحقیقی مطالعے کے ساتھ ان کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ وحی آسمانی اور اس کے آخری جامع اور مکمل ایڈیشن یعنی قرآن حکیم کا گہرا مطالعہ حقیقت کی تلاش اور حقیقت نفس الامری کی دریافت کے نقطہ نگاہ سے کریں۔

پھر اگر ایسا ہو کہ قرآن کی روشنی ان پر واضح ہو جائے' اس کا پیغام انہیں اپنی فطرت کی آواز معلوم ہو' اس کے نور سے ان کے قلوب و اذہان منور ہو جائیں' آفاق و انفس کی حقیقت و ماہیت کے بارے میں تمام بنیادی سوالوں کا تشفی بخش جواب انہیں مل جائے اور انبساطِ معرفت سے ان کے نفوس میں امن اور سکون و اطمینان کی کیفیت پیدا ہو جائے تو اسی کا نام ایمان ہے!

پھر یہی ہوں گے جنہیں ''رسوخ فی العلم'' حاصل ہوگا۔ جن کا علم ذہنی و اخلاقی آوارگی کے بجائے تقویٰ و خشیت الٰہی پر منتج ہوگا۔ جن کی شخصیتیں ''اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا'' کی مجسّم تفسیر اور ع ''قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن'' کی عملی تصویر ہوں گی۔''(۴۸)

پیش نظر علمی تحریک برپا کرنے کے لیے اب اِن نوجوانوں کو تین کام کرنے ہوں گے۔ سب سے پہلا ہے تخریبی کام یعنی فکر مغرب کا مدلّل و مؤثر رد تاکہ ذہنوں سے اِس فکر کا رعب ختم کیا جا سکے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر صاحبؒ لکھتے ہیں:

''مغرب کے فلسفہ و فکر کے مؤثر ابطال اور اس کی تہذیب و تمدن کے واقعی استیصال کا کٹھن کام صرف ان لوگوں کے بس کا ہے جو ''علم حقیقت'' کے ان چشموں سے اچھی طرح سیراب ہوں جو قرآنِ حکیم کی آیاتِ بینات کی صورت میں رواں ہیں۔ ان ہی کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ آج کے فلاسفہ کے لیے ایک نئی ''تہافت''(۴۹) تصنیف کر سکیں اور آج کے منطقیین پر از سرِ نو ''رد''(۵۰) کر سکیں اور فی الجملہ الحاد و مادہ پرستی کے اس سیلاب کا رُخ پھیر دیں جو تقریباً دو صدیوں سے ذہن انسانی کو بہائے لیے چلا

جا رہا ہے۔''(۵۱)

علمی تحریک کے حوالے سے دوسرا کام تعمیری نوعیت کا ہوگا اور وہ ہے جدید علم کلام کی تاسیس' یعنی اسلامی عقائد و نظریات کو دورِ حاضر کی اعلیٰ علمی سطح پر پیش کرنا۔ ڈاکٹر صاحبؒ فرماتے ہیں:

''اس تخریب کے ساتھ انہیں جدید علم الکلام کی تاسیس کا مثبت کام بھی کرنا ہوگا تاکہ ریاضی' طبیعیات' فلکیات' حیاتیات اور نفسیات کے میدان میں جن حقائق کی دریافت آج تک ہوئی ہے اور جو اس حقیقتِ کلی کی ادنیٰ جزئیات ہیں جن کا مظہرِ اتم ایمان ہے' انہیں اسلامی عقائد کے نظام میں اپنے اپنے مقام پر فٹ کیا جا سکے۔ آج سے پینتیس چالیس سال قبل علامہ اقبال مرحوم نے ''الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیلِ جدید'' کے سلسلے میں جو کام کیا تھا اس کا وہ حصہ تو اگرچہ بہت محلِ نظر ہے جو شریعت و قانون اور اجماع و اجتہاد سے بحث کرتا ہے (اور جو فی الواقع ''الٰہیات'' سے براہ راست متعلق بھی نہیں ہے) تاہم اپنے اصل موضوع کے اعتبار سے علامہ مرحوم کی یہ کوشش بڑی فکر انگیز تھی اور جیسا کہ خود علامہ نے کتاب کے دیباچے میں فرمایا تھا کہ..... ''ہو سکتا ہے کہ جیسے جیسے علم آگے بڑھے اور فکر کی نئی راہیں کھلیں' زیر نظر کتاب میں جو خیالات بیان ہوئے ہیں ان کے علاوہ بلکہ ان سے صحیح تر خیالات ظاہر ہوں۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم انسانی فکر کے ارتقاء کا ایک آزاد تنقیدی نقطۂ نگاہ سے مسلسل جائزہ لیتے رہیں.....''

اگر انہی خطوط پر کام جاری رہتا اور کچھ باہمت لوگ اس کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیتے تو ایک بہت وقیع اور قابل قدر کام ہو جاتا' لیکن افسوس کہ خود علامہ مرحوم کے حلقہ اثر میں سے بھی کسی نے اس میدان کو اپنی جولانی طبع کے لیے منتخب نہیں کیا۔

بہرحال جب تک اس میدان میں واقعی قدر و قیمت رکھنے والا کام ایک قابل ذکر حد تک نہیں ہو جاتا یہ امید کہ معاشرے کے ذہین طبقات کو مذہب کی طرف راغب کیا جا سکے گا محض سراب کا درجہ رکھتی ہے۔''(۵۲)

علمی تحریک کے ضمن میں تیسرا کام ہے عصر حاضر میں اسلام کے اجتماعی نظام کے مختلف گوشوں کو عملی صورت میں مرتّب و مدوّن کرنا اور دورِ حاضر کے اجتماعی مسائل کا حل پیش کرنا۔ اس کا ذکر ڈاکٹر صاحبؒ نے یوں کیا:

''الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیل جدید'' کے بعد دوسرا اہم کام یہ ہے کہ حیاتِ دنیوی کے مختلف پہلوؤں یعنی سیاست و قانون اور معاشرت و معیشت کے باب میں اسلام کی

ہدایت ورہنمائی کو مدلّل ومفصّل واضح کیا جائے۔اس ضمن میں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ پچھلے پچاس ساٹھ سال کے عرصے میں خاصا کام مصر اور برصغیر ہندو پاک ہند میں ہوا ہے‘ خصوصاً جماعت اسلامی اور الاخوان المسلمون نے ’’اسلامی نظامِ حیات‘‘(۵۳) اور ’’العدالة الاجتماعیه فی الاسلام‘‘(۵۴) کو تصنیف وتالیف کا مرکزی موضوع بنایا ہے۔تاہم اس سارے کام کو بس ایک اچھی ابتدا قرار دیا جا سکتا ہے.....اس کام کے لیے بھی ظاہر ہے کہ ایک طرف موجودہ دنیا کے مسائل و معاملات کا صحیح فہم اور عمرانیات کے مختلف میدانوں میں جدید رجحانات کا براہِ راست علم ضروری ہے‘ اور دوسری طرف قرآن وسنت میں گہری ممارست لازمی ہے‘ اور جب تک یہ صورت نہ ہو کہ ان دونوں اطراف کا مطالعہ یکساں دقت نظر کے ساتھ کیا جائے‘ معیاری نتائج کی توقع عبث ہے۔‘‘(۵۵)

مطلوب علمی کاموں کے لیے عملی اقدامات کا نقشہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اس طرح پیش کیا:

’’مذکورہ بالا علمی تحریک کے اجراء کے لیے فوری طور پر دو چیزیں لازمی ہیں:

ایک یہ کہ عمومی دعوت وتبلیغ کا ایک ایسا ادارہ(۵۶) قائم ہو جو ایک طرف تو عوام کو تجدیدِ ایمان اور اصلاحِ اعمال کی دعوت دے اور جو لوگ اس کی جانب متوجہ ہوں ان کی ذہنی وفکری اور اخلاقی وعملی تربیت کا بندوبست کرے اور ساتھ ہی اس علمی کام کی اہمیت ان لوگوں پر واضح کرے جو خلوص اور دردمندی کے ساتھ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے آرزومند ہیں اور دوسری طرف ایسے ذہین نوجوان تلاش کرے جو پیش نظر علمی کام کے لیے زندگیاں وقف کرنے کو تیار ہوں۔‘‘(۵۷)

’’دوسرے یہ کہ ایک قرآن اکیڈمی(۵۸) کا قیام عمل میں لایا جائے‘ جو ایک طرف علومِ قرآنی کی عمومی نشر واشاعت کا بندوبست کرے تاکہ قرآن کا نور عام ہو اور اس کی عظمت لوگوں پر آشکارا ہو اور دوسری طرف ایسے نوجوانوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرے جو بیک وقت علوم جدیدہ سے بھی بہرہ ور ہوں اور قرآن کے علم وحکمت سے بھی براہ راست آگاہ ہوں تاکہ متذکرہ بالا علمی کاموں کے لیے راہ ہموار ہو سکے۔‘‘(۵۹)

(۷) غلبۂ دین کا دورِ حاضر میں طریقۂ کار

ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے سیرت النبی ﷺ کے موضوع پر اپنی مایہ ناز تصنیف ’’منہج انقلابِ نبوی ﷺ‘‘ میں نبی اکرم ﷺ کے برپا کردہ ہمہ گیر انقلاب کے چھ مراحل بیان کیے:

(۱) قرآن کے ذریعہ ایک ایسے انقلابی نظریہ کی دعوت دینا جو رائج نظام کے اجتماعی گوشوں پر تیشہ بن

کر گرے۔

(۲) دعوت قبول کرنے والوں کو بیعتِ سمع وطاعت کی منصوص‘ مسنون اور ماثور اساس پر منظّم کرنا۔

(۳) منظّم ہونے والوں کی قرآن کے ذریعہ روحانی‘ اخلاقی اور فکری تربیت کرنا۔

(۴) صبرِ محض کا طرزِ عمل اختیار کرنا یعنی جب تک مناسب وسائل اور افرادی وقت فراہم نہ ہو ہر قسم کی مخالفت اور ظلم کے مقابلہ میں ڈٹے رہنا لیکن کوئی جوابی اقدام نہ کرنا۔

(۵) مناسب وسائل وافرادی قوت کی فراہمی پر رائج ظالمانہ نظام کے خلاف اقدام کرنا۔

(۶) اقدام کے ردّعمل میں رائج نظام کے ساتھ مسلح تصادم کا مرحلہ شروع ہو جائے گا جس میں پامردی سے ڈٹے رہنا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا دورِ حاضر میں غلبۂ دین کے لیے سیرت النبی ﷺ سے ماخوذ مذکورہ بالا تمام مراحل پر عمل کیا جائے گا یا اُس میں کسی اجتہاد کی ضرورت ہوگی۔ڈاکٹر اسرار احمدؒ اِس سوال کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

’’دورِ حاضر میں حالات واقعات اس درجے تبدیل ہو گئے ہیں کہ انقلاب کے آخری مرحلے یعنی مسلح تصادم (Armed Conflict) کے بارے میں اجتہاد کی واقعی ضرورت ہے۔اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ کے دور میں ایک طرف مسلمان اور دوسری طرف کفار تھے‘ اور حربی کافر کی گردن مارنے میں کسی کو کیا جھجک ہو سکتی تھی۔جبکہ آج صورتِ حال یہ ہے کہ اِدھر بھی مسلمان ہیں اور اُدھر بھی مسلمان۔ہمارے حکمران جیسے بھی ہوں‘ ہیں تو مسلمان۔بھٹو‘ بے نظیر‘ ضیاء الحق‘ نواز شریف اور پرویز مشرف سب مسلمان ہیں۔دوسرے یہ کہ اُس زمانے میں طاقت کا فرق صرف تعداد کے اعتبار سے تھا۔اِدھر ۳۱۳ رضا کار (volunteers) تھے تو اُدھر ایک ہزار رضا کار۔اُدھر بھی باقاعدہ تربیت یافتہ مسلح فوج نہیں تھی۔ایسا بھی نہیں تھا کہ اُدھر ٹینک‘ توپیں‘ میزائل اور بم ہوں اور اِدھر مجاہدین صرف تلواریں لیے کھڑے ہوں۔رسول اللہ ﷺ کی فوج کا رسالہ دو گھوڑوں پر مشتمل تھا‘ اُدھر سو گھوڑوں پر مشتمل رسالہ تھا۔چنانچہ تعداد میں فرق ضرور تھا‘ نوعیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہ تھا۔

مزید برآں عمرانی ارتقاء (Social Evolution) کے نتیجے میں آج اس بات کا امکان موجود ہے کہ بغیر جنگ کے حکومت تبدیل کی جا سکتی ہے۔آج یہ مانا جاتا ہے کہ ریاست اور ہے‘ حکومت اور ہے۔شہری ریاست کے وفادار ہوتے ہیں‘ حکومت کے

نہیں۔حکومت کی تبدیلی تو عوام کا حق ہے۔اُس وقت تک ابھی عمرانی ارتقاء اس سطح تک نہیں پہنچا تھا' لہٰذا حکومت اور ریاست گڈمڈ تھے۔''(۶۰)

اس کے بعد ڈاکٹر صاحبؒ تبدیل شدہ صورتِ حال میں غلبۂ دین کے لیے ممکن طریقہ ہائے کار کا ذکر کرتے ہیں:

''اب یہاں پر بغیر جنگ کے حکومت تبدیل کرنے کے دو راستے ہیں' ایک الیکشن کا راستہ اور ایک احتجاجی تحریک (agitation) کا راستہ۔الیکشن کے راستے سے نظام نہیں بدل سکتا' خواہ الیکشن کتنا ہی شفاف اور منصفانہ ہو۔اس سے تو صرف نظام کو چلانے والے ہاتھ بدل جاتے ہیں۔اس لیے کہ آپ کے معاشرے میں طاقت کے جو ستون موجود ہیں الیکشن میں انہی کا انعکاس ہوگا۔اگر ملک میں جاگیردارانہ نظام ہے تو کوئی جاگیردار ہی منتخب ہو کر آئے گا۔اگر سرمایہ دارانہ نظام ہے تو کوئی سرمایہ دار ہی آئے گا۔یہ تو شہروں میں کچھ تبدیلی ہوتی رہتی ہے کہ کبھی کراچی میں جماعت اسلامی کی پوزیشن مستحکم ہوگئی تھی' کبھی ایم کیو ایم کی ہوگئی۔کیونکہ شہروں میں نہ جاگیردار ہیں نہ قبائلی سردار۔البتہ ہمارے دیہی علاقوں میں سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام قائم ہے۔سرمایہ دار اور جاگیردار الیکشن کے ذریعے منتخب ہو کر اقتدار میں آئیں گے تو کیا وہ جاگیرداری اور سرمایہ داری ختم کر دیں گے؟اس طرح تو وہ اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماریں گے۔تو جان لیجئے کہ الیکشن کسی نظام کو چلانے کے لیے ہوتا ہے' اسے بدلنے کے لیے نہیں ہوتا۔امریکہ میں دو پارٹیز ہیں' ری پبلیکنز اینڈ ڈیموکریٹس۔ان دونوں کے مابین امریکہ کے نظام کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔دونوں پارٹیوں کا دعویٰ صرف یہ ہے کہ ہم اس نظام کو اچھے انداز سے چلا سکتے ہیں۔ان کے منشور میں فرق ہوگا تو ٹیکسیشن پالیسی' ہیلتھ پالیسی یا امیگریشن پالیسی کا ہوگا۔برطانیہ میں کنزرویٹوز اور لیبر پارٹی کے نام سے دو پارٹیاں ہیں۔نظام کے بارے میں ان کے مابین بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ہاں' اگر امریکہ میں کمیونسٹ ہوں تو وہ نظام کے خلاف بولیں گے۔چنانچہ سی ایٹل اور واشنگٹن میں گلوبلائزیشن کے خلاف ہونے والے مظاہرے یہ پتا دیتے ہیں کہ وہاں کمیونسٹ عنصر موجود ہے۔لیکن ظاہر بات ہے وہ لوگ الیکشن کا راستہ کبھی بھی اختیار نہیں کریں گے' الیکشن کے ذریعے ان کی کامیابی کا سوال ہی نہیں۔''(۶۱)

الیکشن کے طریق کار کی نفی کے بعد ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے قابل عمل طریق کار یوں پیش کیا:

''دریں حالات ایک ہی راستہ باقی ہے۔وہ یہ کہ ایک پُرامن' منظم عوامی تحریک اٹھے

جو توڑ پھوڑ نہ کرے اور سرکاری یا غیر سرکاری املاک کو نقصان نہ پہنچائے' البتہ یہ لوگ خود جانیں دینے کو تیار ہوں۔اس کو میں ''یک طرفہ جنگ'' سے تعبیر کرتا ہوں۔یہ لوگ سڑکوں پر آ کر منکرات کے خلاف احتجاجی مظاہرے کریں۔یہ لوگ حکومت پر اپنا موقف واضح کریں کہ ہم نے منکرات کے انسداد کے لیے آپ سے بہت درخواستیں کیں' آپ کے آگے ہاتھ جوڑے کہ خدارا سود ختم کر دو' لیکن اب ہم picketing کریں گے' دھرنا دیں گے' بینکوں کا گھیراؤ کریں گے اور اس سودی نظام کو جیتے جی نہیں چلنے دیں گے۔چلاؤ ہم پر گولیاں!

میرے خیال میں اس وقت انقلاب کے لیے یہی قابل عمل طریقہ ہے۔اگر ہم مشتعل ہو کر اسلحہ اٹھائیں تو کس کے خلاف اٹھائیں گے؟ بری افواج یا ایئر فورس کے خلاف؟ کیا ہماری ماضی کی حکومتوں نے بلوچستان میں دو مرتبہ ایئر فورس استعمال نہیں کی؟ کیا ایئر فورس کے ذریعے سے حافظ الاسد نے ایک دن میں ہزاروں اخوان ختم نہیں کر دیے تھے؟ اور ان کا مرکز بمباری کر کے تباہ و برباد نہیں کر دیا تھا؟ تو آج مقابلہ بہت غیر مساوی (unequal) ہے۔جہاں ممکن ہو دو طرفہ جنگ بھی ہو سکتی ہے' کسی پہاڑی ملک میں کوئی چھاپہ مار جنگ بھی ہو سکتی ہے' یہ حرام نہیں ہے۔دین کو قائم کرنے کے لیے حضور ﷺ نے جنگ لڑی ہے تو ہم بھی لڑ سکتے ہیں اور کلمہ گو کے خلاف بھی لڑ سکتے ہیں۔امام ابوحنیفہؒ کے موقف کے مطابق مسلمان حکمران اگر فاسق و فاجر ہوں تو ان کے خلاف بغاوت کی جا سکتی ہے۔پہلے تو امر بالمعروف و نہی عن المنکر زبان سے کیا جائے۔اگر یہ زبان سے کہنا مؤثر ثابت نہ ہو تو پھر تلوار کے ذریعے سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کیا جا سکتا ہے۔تو جنگ اگرچہ جائز ہے' لیکن موجودہ حالات میں عملاً ممکن نہیں ہے۔آج کے مسلمان حکمرانوں کے خلاف یک طرفہ جنگ ہی موزوں لائحہ عمل ہے۔''(۶۲)

(۸) نور و بشر کے مسئلے کا معتدل حل

نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ کے حوالے سے عقائد کی بحث میں ایک نزاعی مسئلہ نور و بشر کا ہے۔یعنی آپ ﷺ بشر تھے یا نور؟ عوامی سطح پر مذہبی جلسوں میں اس مسئلے پر دھواں دار تقریریں ہوتی ہیں جن میں جوش و خروش اور غیظ و غضب کا اظہار ہوتا ہے۔ایک گروہ آپ ﷺ کی بشریت کی نفی اور نورانیت کے اثبات پر دلائل دیتا ہے اور دوسرا گروہ آپ ﷺ کی نورانیت کی نفی اور بشریت کے اثبات پر زور دیتا ہے۔مناظرے اور مباحثے کا انداز فریقین میں باہم شدت اور تلخی بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اس مسئلہ کا نہایت متوازن و معتدل حل پیش کیا:

''جان لیجیے کہ نبی اکرم ﷺ کے معاملے میں نہ یہ کہنا درست ہے کہ آپ ﷺ بشر نہیں تھے بلکہ نور تھے اور نہ یہ کہنا درست ہے کہ آپ ﷺ نور نہیں تھے بلکہ بشر تھے۔ دونوں باتیں یکساں غلط ہیں' اصل حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ بیک وقت بشر بھی تھے اور نور بھی تھے۔ اور یہ معاملہ صرف رسول اللہ ﷺ کا نہیں ہے بلکہ میرا اور آپ کا اور ہر انسان کا ہے۔ ہر انسان کے اندر اُس کے وجود کے دو حصے ہیں۔ ایک اس کا ''حیوانی'' وجود ہے' وہ خاکیٔ الاصل ہے جو اِس زمین سے بنا ہے۔ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے ظلمانی ہے۔ اس میں تاریکی ہے' اس میں پستی کا رجحان ہے' اس میں برائی کا میلان ہے۔ قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کے الفاظ نقل ہوئے ہیں: ﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ﴾ (یوسف:۵۳) ''اور میں اپنے نفس کی براءت نہیں کر رہا ہوں' یقیناً نفس تو برائی پر اُبھارتا ہے''۔ لیکن انسان مجرد اِس پستی اور خاکیٔ الاصل وجود ہی کا نام نہیں ہے' بلکہ اس کے وجود کا دوسرا حصہ ''روح'' ہے۔

نقطۂ نوری کہ نامِ او خودی
زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی

انسانِ اوّل کو آدمؑ بنانے والی چیز یہی روحِ خداوندی تھی جو اُن میں پھونکی گئی۔ اور وہ روح خاکی اور ظلمانی نہیں ہے' بلکہ نورانی حقیقت رکھنے والی شے ہے۔ وہ ملائکہ کی ہم پلّہ ہی نہیں ملائکہ کی مسجود ہے۔ ملائکہ نوریٔ الاصل ہیں تو کیا روح خاکیٔ الاصل ہے؟ نہیں' روح خاکی اور ظلمانی نہیں ہے' بلکہ نورانی ہے۔ بقولِ اقبال :ؔ

ہے ذوقِ تجلّی بھی اِسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے!

حواسِ خمسہ یعنی دیکھنا' سننا' سونگھنا' چکھنا اور چھونا تو حیوانات میں بھی ہیں! انسان نے بھی اپنی حقیقت اگر یہی سمجھی تو اُس نے گویا اپنی اصل عظمت کو نہیں پہچانا۔ ادراک تو اصل میں اپنے سے باہر کی کسی شے کو محسوس کرنا ہے' جبکہ روشنی تو خود اپنا ظہور چاہتی ہے' اپنی تجلّی چاہتی ہے۔ تو انسان کی حقیقت یہ ہے کہ اس کے وجود کے دو حصے ہیں' ایک اس کا یہ حیوانی وجود ہے' جو خاکیٔ الاصل ہے' ظلمانیٔ الاصل ہے۔ اس کا میلان پستی اور گناہ کی طرف ہے۔ اور ایک اس کا روحانی وجود ہے جو نورانی الاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا تھا: ﴿فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ﴾ (الحجر) ''پس جب میں اسے (آدمؑ کو) بنا سنوار لوں اور اس میں

اپنی روح میں سے پھونکوں تو گر پڑنا اس کے سامنے سجدے میں''۔ یہاں روح کی نسبت اللہ تعالیٰ نے خود اپنی طرف کی ہے۔

تو یہ ہے ہمارا وہ نورانی عنصر جو ہر ایک انسان میں ہے۔ لیکن ع ''درحفظِ مراتب نہ کنی زندیقی'' کے مصداق سب کا نور برابر تو نہیں ہے۔ کسی کا محض ایک ٹمٹماتا ہوا دیا ہے۔ کسی کی اس نورانیت پر اس کے نفس کی ظلمانیت اس طرح چھا گئی ہے کہ وہ نور معدوم کے درجے میں ہے۔ یعنی اس کی فطرت کا نور بجھ چکا ہے' جبکہ کسی کا وہ نور اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے اس کی تمثیل یوں بیان کی ہے: ﴿يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ۭ نُوْرٌ عَلٰي نُوْرٍ ۭ﴾ (النور:۳۵) ''(کسی کی فطرت کا نور اتنا صاف اور شفاف ہے کہ) بھڑک اٹھنے کو بے تاب ہے' چاہے اسے آگ نے چھوا تک نہ ہو۔ روشنی پر روشنی ہے''۔ یہ ہے وہ نور جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شخصیت میں موجود تھا۔ ابھی وحی کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا' لیکن ان کے اندر اخلاقِ حسنہ کے انوار پہلے سے موجود تھے۔ ایسے ہی تمام صدیقین اور انبیاءؑ کے اندر نورِ فطرت موجود ہوتا ہے۔ اب اس تناظر میں دیکھئے تو نبی اکرم ﷺ کی شخصیت مبارکہ چونکہ بلند ترین ہے تو آپ ﷺ کی نورانیت بھی اتنی کامل ہے کہ اس نے خاکی وجود کی ظلمانیت کو بالکل معدوم کر دیا ہے۔ اس معنی میں اگر کہا جائے کہ نبی اکرم ﷺ نورِ مجسم ہیں تو غلط نہیں ہے۔

تو یہ دونوں چیزیں بیک وقت صحیح ہیں۔ نبی اکرم ﷺ بیک وقت بشر بھی ہیں اور نور بھی ہیں۔ آپ ﷺ کی بشریت کا کون انکار کرے گا! آپ ﷺ کی ولادت ہوئی ہے جیسے کسی انسان کی ولادت ہوتی ہے۔ آپ ﷺ کے بھی وہی دو ہاتھ اور دو پاؤں تھے۔ وہی انسانی خون آپ ﷺ کے وجود میں بھی سرایت کیے ہوئے تھا اور گردش کر رہا تھا۔ طائف میں آپ ﷺ پر پتھراؤ ہوا ہے تو زخموں میں سے خون رسا ہے۔ میدانِ اُحد میں جب تلوار کا وار آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک پر لگا ہے تو خون کا فوارہ چھوٹا ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے شادی کی ہے اور آپ ﷺ کے ہاں اولاد ہوئی ہے۔ لیکن اِس سب کے باوجود نبی اکرم ﷺ کی نورانیت کی نفی ہرگز نہ کیجیے! آپ ﷺ کی نورانیت کی نفی درحقیقت اِس دَور کا مادّہ پرستانہ فکر ہے جو میری آج کی بحث کا اصل موضوع ہے۔ ہم نے مادہ پرستانہ فکر اپنے ذہنوں پر اتنا مسلّط کر لیا ہے کہ ہم روح کی حقیقت اور اس کے جداگانہ تشخّص سے یا تو بالکلّیہ منکر ہو گئے ہیں یا اس کا زبان پر ذکر لاتے ہوئے ہمیں حجاب محسوس ہوتا ہے۔ بقول اکبر الٰہ آبادی ؔ

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اِس زمانے میں!

کہ روحانیت کی باتیں کرتے ہو؟ روح کی بات کرتے ہو؟ روح کو کوئی علیحدہ وجود مانتے ہو؟ تو یہ چیزیں ہمارے فکر اور نظریات کے دائرے سے اس طور سے باہر چلی گئی ہیں کہ اب ہم سمجھتے ہیں کہ انسان تو بس اسی حیوانی وجود کا نام ہے۔ ہم اپنے اس وجودِ حیوانی ہی کو اصل انسان سمجھے بیٹھے ہیں' اس لیے نورانیت کی نفی ہو رہی ہے۔

اس بات کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ہمارا جو نورانی عنصر ہے' ایمان اور عمل صالح سے اس کی نورانیت میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کے برعکس گناہوں اور نفسانیت سے یہ نور بجھتا چلا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں سورۃ الحدید اور سورۃ التحریم میں دو جگہ میدانِ حشر کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ اُس دن اہل ایمان کی شان یہ ہوگی کہ:

﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝﴾ (الحدید)

''اُس دن آپ مؤمن مردوں اور عورتوں کو دیکھیں گے کہ اُن کا نور اُن کے آگے آگے اور اُن کے دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا۔ (اُن سے کہا جائے گا) آج بشارت ہے تمہارے لیے ایسے باغات کی جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں' ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی ہے بڑی کامیابی۔''

آگے منافقین کے بارے میں فرمایا گیا:

﴿يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَاۗءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ۭ﴾ (الحدید: ۱۳)

''اُس دن منافق مردوں اور عورتوں کا حال (جو دنیا میں چراغ گل کر کے جائیں گے) یہ ہوگا کہ وہ اہل ایمان سے استدعا کریں گے: ذرا ہماری طرف دیکھو (ذرا ہمیں مہلت دو)' تاکہ ہم تمہارے نور سے استفادہ کریں۔ کہا جائے گا لوٹ جاؤ پیچھے کی طرف (اگر ہو سکتا ہے تو دنیا میں واپس جاؤ) اور اس نور کی تحصیل کر کے آؤ۔''

سورۃ التحریم' آیت ۸ میں ہے:

﴿نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا

وَاغْفِرْ لَنَا ۭ اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾

''اُن کا نور اُن کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا اور وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے ربّ! ہمارا نور ہمارے لیے مکمل کر دے اور ہم سے درگزر فرما' یقیناً تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔''

اس نور کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ قیامت کے دن کسی کا نور بس اتنا ہوگا کہ اس سے صرف اس کے قدموں کے آگے روشنی ہو جائے گی' اور کسی کا نور اِس قدر ہوگا کہ اس کی روشنی مدینہ منورہ سے صنعاء تک پہنچے گی (۶۳)۔ یعنی اُس روز کسی کا نور بہت تھوڑا ہوگا کہ بس اس سے قدموں کے آگے آگے روشنی ہوگی۔ اور قیامت کے دن یہ نور بھی بہت غنیمت ہوگا جس کو نصیب ہو گیا۔ اس لیے کہ اندھیرے میں ایک ٹارچ بھی بہت غنیمت ہوتی ہے جس سے آپ بالآخر منزلِ مراد تک پہنچ سکتے ہیں۔ جبکہ کسی کا نور اُس روز بہت زیادہ ہوگا جس سے ہر سو چراغاں ہو جائے گا۔ یہ حفظِ مراتب ہے۔ اس تناظر میں دیکھئے تو محمد رسول اللہ ﷺ کا نور کس قدر ہوگا! تو ان باتوں کو ذہن میں رکھیے تو جھگڑا ختم ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ بیک وقت ''بشر'' بھی ہیں اور ''نور'' بھی ہیں۔'' (۶۴)

(۹) فلسفۂ وحدت الوجود کی حکیمانہ تعبیر

ابن عربیؒ' مولانا رومؒ' شیخ احمد سرہندیؒ' شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور دیگر نامور صوفیاء وحدت الوجود کے نظریہ کو درست مانتے ہیں۔ سطحی سا علم رکھنے والے بعض عناصر ''وحدت الوجود'' اور ''ہمہ اوست'' (Pantheism) کے درمیان فرق کو نہ سمجھ سکے۔ وہ ان دونوں تصورات کو ایک ہی سمجھ کر مذکورہ بالا شخصیات کے بارے میں سوءِ ظن میں مبتلا ہو گئے۔ کچھ لوگ تو انہیں مشرک کہہ دیتے ہیں اور باقی لوگوں کی رائے بھی یہ ہے کہ وہ گمراہی کی طرف چلے گئے۔ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ نے وحدت الوجود اور ہمہ اوست کے فرق کو بڑی عمدگی سے واضح کر کے اسلاف کے بارے میں سوئے ظن کا ازالہ کر دیا۔ فلسفۂ وحدت الوجود کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اب ذرا نظریہ ''وحدت الوجود'' کی بحث کی طرف آیئے کہ صرف اللہ کا وجود مطلق ہے' قدیم ہے اور دائم ہے' جبکہ ماسوٰی کا وجود عطائی ہے' محدود ہے' حادث اور فانی ہے۔ گویا وجود تو صرف اسی کا ہے' کسی اور کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ یہ ماسوٰی سے وجود کی نفی ہے۔ یہ ''وحدت الوجود'' ہے اور درحقیقت یہ توحید فی الصفات کی بلند ترین منزل ہے۔

جو یہاں نہیں پہنچا وہ فکری سطح کے اعتبار سے توحید کی آخری منزل تک نہیں پہنچا۔‘‘(۶۵)

پھر ڈاکٹر صاحبؒ ’’وحدت الوجود‘‘ اور ’’ہمہ اوست‘‘ کے فرق کو یوں واضح کرتے ہیں:

’’نظریہ ’’ہمہ اوست‘‘ کو تو میں بھی کفر اور شرک سمجھتا ہوں۔ لیکن ہمہ اوست اور وحدت الوجود کے فرق کو جان لیجیے! ’’ہمہ اوست‘‘ کو یوں سمجھئے کہ برف پگھل کر پانی بن گیا تو برف معدوم ہوگئی اور اب پانی ہی برف ہے۔ لہٰذا اِس اعتبار سے تو یہ کائنات حقیقت قرار پاتی ہے اور ’نعوذ باللہ‘ خدا اس میں گم ہو جاتا ہے۔ جبکہ وحدت الوجود یہ ہے کہ حقیقت وجود صرف خدا کے لیے ہے اور ماسوٰی کا وجود ہی نہیں ہے۔ تو ان دونوں نظریات میں زمین و آسمان کا فرق واقع ہوگیا اور یہ ایک دوسرے کی ضد ہوگئے۔ اس لیے کہ ’’ہمہ اوست‘‘ میں مخلوق حقیقت ہے اور خالق اس میں گم ہے اور ’’وحدت الوجود‘‘ میں خالق حقیقت ہے اور مخلوق کا وجود گم ہے۔ لہٰذا جب ان دونوں نظریات کو خلط مبحث کیا گیا تو بہت سے لوگوں کو مغالطہ ہوگیا۔ جب یہ confusion زیادہ ہوا تو اس میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ نے اصلاح کی اور انہوں نے ’’وحدت الوجود‘‘ کے بجائے ’’وحدت الشہود‘‘ کا نظریہ پیش کیا۔‘‘(۶۶)

وحدت الشہود کے نظریہ کی وضاحت ڈاکٹر صاحبؒ نے اِن الفاظ میں کی:

’’وحدت الشہود یہ ہے کہ حقیقی وجود صرف اللہ کا ہے اور کائنات کا وجود اعتباری ہے اور اُس کا محض عکس ہے۔ جیسے اصل وجود درخت کا ہوتا ہے‘ لیکن اس کا سایہ جو زمین پر پڑ رہا ہوتا ہے وہ نظر تو آ رہا ہوتا ہے لیکن اس کا وجود کوئی نہیں ہوتا۔ ایسے ہی یہ ساری کائنات اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے اظلال اور سائے ہیں اور ان کی کوئی ذاتی حقیقت نہیں ہے۔ جیسے کسی شاعر نے کہا: ؎

کلُّ ما فی الکون وھمٌ او خیال
او عکوسٌ فی المرایا او ظلال

کہ جو کچھ اس کائنات میں ہے وہ محض وہم ہے یا خیال ہے‘ یا جیسے شیشے میں کوئی عکس ہوتا ہے یا سایہ۔ آپ شیشے میں نظر تو آ رہے ہوتے ہیں لیکن وہاں ہوتے نہیں ہیں۔ اسے ایک مثال سے یوں واضح کیا گیا کہ ایک لکڑی لے کر اس کے ایک سرے پر کپڑا باندھیں اور اس کے اوپر مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگا دیں اور اسے ایک دائرے میں تیزی کے ساتھ حرکت دیں تو دیکھنے والوں کو یہ ایک آتشیں دائرہ نظر آتا ہے‘ لیکن درحقیقت وہ آگ کا دائرہ نہیں ہوتا‘ بلکہ شعلے کی حرکت آتشیں دائرے کا روپ دھار

لیتی ہے۔ اب دیکھئے اس نظریے میں کائنات اور ماسوٰی کی نفی ہوگئی اور اثبات صرف اللہ کا ہوا۔ ’’وحدت الوجود‘‘ اور ’’وحدت الشہود‘‘ میں صرف تعبیر کا فرق ہے‘ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ نے لوگوں کو سمجھانے کے لیے یہ فرق کیا ہے۔ یہ محض سمجھانے کا ایک لطیف سا انداز ہے۔‘‘(۶۷)

بحث کے آخر میں وجودِ باری تعالیٰ کی ہمہ گیریت اور یکتائیت کو سمجھانے کے لیے ڈاکٹر صاحب نے ایک خوبصورت تمثیل کا سہارا لیا ہے:

’’اس کی ایک اور بہترین تمثیل اِس دَور میں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے یہ بیان کی کہ تم ذرا تصور کر کے اپنے ذہن میں تاج محل یا مینارِ پاکستان کا نقشہ لے آؤ۔ یہ گویا تمہاری محض ایک خیالی تخلیق ہے جو تمہارے ذہن میں ہے اور تمہارے ذہن سے باہر اِس کا کوئی وجود نہیں۔ اس کے اوپر بھی تم ہو‘ اس کے نیچے بھی تم ہو‘ اس کے باہر بھی تم ہو اور اس کے اندر بھی تم ہو۔ تو یہی نسبت خالق و مخلوق کے مابین ہے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کے بارے میں فرماتا ہے: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ (الحدید:۳) ’’وہی اوّل ہے‘ وہی آخر ہے‘ وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے‘‘۔ اور یہ کائنات محض اس کے خیال کے مانند ہے۔ ہمارا خیال تو بڑا کمزور سا خیال ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا خیال بڑا ٹھوس اور پختہ خیال ہے۔ البتہ یہ جان لیجیے کہ جس طرح ہماری ذہنی تصویر کا انحصار اور قیام ہماری توجہ پر ہوتا ہے‘ جیسے ہی توجہ ہٹتی ہے تصویر بھی ذہن سے محو ہو جاتی ہے‘ اسی طرح اس کائنات کا قیام بھی اللہ تعالیٰ کی توجہ سے ہے۔ اُس کی توجہ ہٹے تو یہ معدوم ہے۔ اسی لیے کہا گیا کہ وہ الحیّ القیّوم ہے‘ از خود ہے اور اس کائنات کو تھامے ہوئے ہے۔ جیسے تم اپنی توجہ کو مرتکز رکھو گے تو وہ ہیولیٰ تمہارے ذہن میں رہے گا‘ تم قیوم ہو اُس کے‘ ایسے ہی اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا القیوم ہے‘ اسے تھامے ہوئے ہے۔‘‘(۶۸)

(۱۰) شادی بیاہ کے ضمن میں ایک اصلاحی تحریک

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے معاشرہ میں شادی بیاہ‘ ولادت اور وفات کے مواقع پر جو رسوم ادا کی جاتی ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر ہندوانہ تہذیب کی الباقیات السیئات ہیں اور ان کا اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ خاص طور پر شادی کے موقع پر لوازمات و رسومات کے روز افزوں طومار نے جس طرح ایک سماجی برائی کی شکل اختیار کر لی ہے اس کا شدید احساس ہر صاحبِ نظر اور ملک و ملت کا درد رکھنے والے انسان کو ہے۔ امیروں کے لیے تو یہ

تقریبات ورسومات صرف ''چونچلوں'' یا پھر اپنے ''کالے دھن'' کے نمائش واظہار کے ذرائع کی حیثیت رکھتی ہیں' لیکن عوام کی اکثریت کے لیے یہ ناقابل برداشت بوجھ یا بالفاظ دیگر پاؤں کی بیڑیاں اور گلے کا طوق بن گئی ہیں' جن کے باعث شادی میں تاخیر ہوتی ہے اور اس ''اُمّ الخبائث'' (شادی کی تاخیر) کے بطن سے اخلاقی اور نفسیاتی امراض کا ایک لامتناہی سلسلہ جنم پاتا چلا جاتا ہے۔ ہمارا دین' دین فطرت ہے۔ اس نے فطرت کے مطابق ان تمام مواقع اور تقاریب کے لیے ایسی مبنی برعدل رہنمائی عطا فرمائی ہے جس سے معاشی اعتبار سے کسی بھی معیار کے خاندان کے لیے ناقابل برداشت بوجھ کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔

ملت کے چند دیگر مصلحین کی طرح ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ بھی اپنی تقاریر کے ذریعہ شادی کے موقع پر بے جا رسومات کی اصلاح کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''میں نے ''خطبۂ نکاح'' سے قبل ''خطاب'' کا سلسلہ شروع کیا جس میں ان آیات و احادیث کی مختصر تشریح بھی ہوتی تھی جو نکاح کے مسنون خطبے میں شامل ہیں اور کچھ عمومی دعوت ونصیحت بھی ہوتی تھی اور خاص طور پر حدیث مبارکہ ((اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ)) کے ضمن میں جہاں رہبانیت کی نفی ہوتی تھی' وہاں سنت کا وسیع تر تصور بھی سامنے رکھا جاتا تھا اور آخر میں نہایت زور دے کر کہا جاتا تھا کہ ''اتباعِ سنت'' کے پہلے قدم کے طور پر کم از کم شادی بیاہ کی تقریبات اور رسومات کے ضمن میں تو ہمیں یہ طے کر ہی لینا چاہیے کہ ان میں سے صرف وہی چیزیں باقی رکھی جائیں جن کا ثبوت آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مل جائے اور باقی تمام بعد کی ایجاد کردہ یا باہر سے درآمد شدہ رسومات کو پوری ہمت اور جرأت کے ساتھ پاؤں تلے روند دیا جائے۔ مثلاً یہ کہ نکاح مسجد میں ہونا چاہیے (۶۹)' جہیز اور بری وغیرہ کی نمائش بالکل نہیں ہونی چاہیے' گھروں کی تزئین وآرائش اور بالخصوص روشنی وغیرہ پر اسراف سے بچنا چاہیے اور دعوتِ طعام صرف ایک ہونی چاہیے' یعنی دعوتِ ولیمہ۔ لڑکی والوں کی جانب سے نکاح کے موقع پر دعوت طعام کا سلسلہ بالکل بند ہونا چاہیے' وغیرہ وغیرہ۔'' (۷۰)

مسلسل پانچ چھ برس تک یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا کہ لوگ ڈاکٹر صاحب کی باتیں سن کر نگاہیں نیچی کر لیتے تھے' فوری تأثر کے آثار بھی ان کے چہروں پر ظاہر ہوتے تھے۔ بعد میں بہت سے لوگ اس وعظ کی تائید وتحسین بھی فرماتے تھے' لیکن جب موقع آتا تھا تو کرتے وہی

کچھ تھے جو معاشرے میں رائج تھا۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۳ء کے اواخر میں ڈاکٹر صاحب کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر ابصار احمد انگلینڈ سے پی ایچ ڈی کی تکمیل کر کے واپس آئے اور ان کی شادی کا مرحلہ آیا۔ وہ تمام بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے اور گویا خاندان کی ایک نسل کی سطح پر یہ آخری شادی تھی۔ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے فیصلہ کن اقدام کا عزم کیا۔ لکھتے ہیں:

> ''..... کراچی میں بعض تجارت پیشہ برادریوں میں نکاح کی مجالس کے مساجد میں انعقاد کا معمول کافی عرصہ سے جاری ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ کراچی سے جس برائی کا آغاز ہو' اسے لاہور یا پنجاب کے دور دراز گوشوں تک پہنچنے میں کوئی دیر نہیں لگتی' لیکن ایک بھلا کام جو وہاں عرصے سے ہو رہا ہے' اس کے بارے میں یہاں تا حال سوچا بھی نہیں گیا۔ چنانچہ میں نے اپنے بھائی کا نکاح مسجد میں منعقد کر کے اور تمام غیر اسلامی رسوم سے اجتناب کر کے اصلاحی کام کا آغاز کر دیا ہے۔ نیز میں نے اس کے ساتھ ہی ''میثاق'' (۷۱) میں اپنے ان فیصلوں کا بھی اعلان کر دیا کہ میں آئندہ سے:
>
> ا) کسی بارات میں شرکت نہیں کروں گا' کیونکہ میرے محدود مطالعہ کی حد تک بارات کا رائج الوقت طریقہ خالص ہندوانہ تصورات پر مبنی ہے۔
>
> ب) نکاح کے موقع پر کسی دعوتِ طعام میں شامل نہیں ہوں گا' کیونکہ خیر القرون سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ شادی کے ضمن میں لڑکے والوں کی طرف سے دعوتِ ولیمہ مسنون ہے' جس کا نہ صرف ثبوت بلکہ نبی اکرم ﷺ کا تاکیدی حکم بھی ملتا ہے۔
>
> ج) نکاح کی کسی ایسی تقریب میں شرکت نہیں کروں گا جو مسجد میں منعقد نہ ہو۔
>
> الحمد للّٰہ والمنۃ! میں اپنے ان فیصلوں پر کاربند ہوں۔ میں آپ حضرات کو مخلصانہ مشورہ دوں گا کہ صرف نکاح کے مسجد میں انعقاد پر اکتفا نہ کیجیے' بلکہ معاشرے سے شادی بیاہ کی ان تمام رسومات کو ختم کرنے کی کوشش کیجیے جن کا اسلام سے سرے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جن کا طومار اور بوجھ ہم نے خود اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔ شادی بیاہ کی ان تمام رسوم کا' جن کا ہمارے ہاں رواج ہے' جب بھی منصفانہ جائزہ لیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ ان کی اصل ہندوانہ رسم ورواج ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو قرآن حکیم اور اُسوۂ رسول ﷺ کے ذریعے ہمارے کاندھوں پر سے بوجھ اتارے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ﴾ ''اور (ہمارا یہ نبی اُمّیؐ) لوگوں پر سے وہ بوجھ اُتارتا ہے جو اُن پر لدے ہوئے تھے اور

وہ بند شیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے!'' پس نبی اکرم ﷺ کا احسانِ عظیم یہ ہے کہ آپ ﷺ نے دین کو آسان سے آسان بنایا ہے۔ آپ ﷺ نے ہدایت دی کہ ((یَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا)) (متفق علیہ) ''آسانیاں پیدا کرو' مشکلات پیدا نہ کرو''۔ لیکن ہم ہیں کہ مشکل پسند بن گئے ہیں۔ ہم نے شادی بیاہ کی تقریب میں لاتعداد اضافی رسوم کو اختیار کر رکھا ہے' جس سے شادی ایک بے انتہا گراں مسئلہ بن گیا ہے۔''(۷۲)

جہیز کا مطالبہ کرنے والوں کو شرم دلاتے ہوئے ڈاکٹر صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

''میں کہا کرتا ہوں کہ بیٹی والوں کا ایثار دیکھو کہ وہ اپنے لختِ جگر کو دوسروں کے حوالے کر رہے ہیں' لیکن پھر بھی بیٹے والوں کا دل نہیں بھرتا اور رسومات کے نام پر اُن کے مطالبات کی فہرست کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔ جہیز ویسے ہی ہندوانہ رسم ہے' لیکن پہلے یہ ہمارے ہاں عام گھریلو استعمال کی اشیاء تک محدود رہتا تھا' لیکن اب تو بیٹے والوں کو فریج بھی چاہیے' ٹیلی ویژن بھی اور کار بھی! میں نے سنا ہے کہ مکان اور فلیٹ کا بھی مطالبہ ہوتا ہے۔ خدارا غور کیجیے کہ جس بچی کے باپ کے پاس یہ سب مطالبات پورے کرنے کے وسائل و ذرائع نہ ہوں اور پھر اس کی ایک نہیں اور بھی بچیاں ہوں تو وہ کیا کرے' کہاں جائے' اپنی سفید پوشی کا بھرم کیسے قائم رکھے اور اپنی جوان بیٹیوں کو کیسے بیاہے!!''(۷۳)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحبؒ نے جن اقدامات کا فیصلہ کیا وہ شدت کا رنگ لیے ہوئے ہیں لیکن جب تک ایسی سختی نہ کی جائے لوگ اپنی گردنوں سے رسومات کے بوجھ اتارنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر صاحبؒ بیان فرماتے ہیں:

''مجھے اعتراف ہے کہ اس معاملے میں کسی قدر شدت کی صورت پیدا ہوئی' لیکن میں پوری طرح مطمئن ہوں کہ اس کے بغیر معاملہ کسی طرح ٹس سے مس نہ ہوتا۔ الحمدللہ کہ میرے رفقاء واحباب میں بہت سے لوگوں نے اس معاملے میں میرا پورا ساتھ دیا جس کے نتیجے میں اس اصلاحی کوشش نے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی۔''(۷۴)

۲۷/اگست ۱۹۸۱ء کو بعد نمازِ مغرب ڈاکٹر صاحبؒ کی تیسری بچی کا عقدِ نکاح' مسجد جامع القرآن لاہور میں ڈاکٹر صاحب کے طے کردہ اصولوں کے تحت منعقد ہوا۔ اس پر انگریزی روزنامے ''پاکستان ٹائمز'' نے بھی ''An Austere Marriage'' کا چوکھٹا نمایاں طور پر لگایا اور جناب م ش نے تو اپنی ڈائری (نوائے وقت ۳۰ اگست ۱۹۸۱ء کے کالم) میں تحریر کیا:

ایک ٹن وعظ کے مقابلے میں ایک اونس عمل زیادہ وزنی ہوتا ہے!!

''ایک ٹن وعظ کے مقابلے پر ایک اونس عمل زیادہ وزنی ہوتا ہے''۔ اس اصول کا عملی مظاہرہ گزشتہ جمعرات کو قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن لاہور میں اس وقت ہوا جب مشہور عالمِ دین اور مفسرِ قرآن ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنی بیٹی کی شادی کی جملہ تقریبات عین سنّتِ نبویؐ کے مطابق انجام دے کر ایک عملی مثال قائم کی۔ میں نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ہزاروں کی تعداد میں مواعظِ حسنہ میں شرکت کی ہے لیکن اس موقع پر میری روح نے ان کی تقریر دل پذیر کے جو اثرات قبول کیے وہ انمٹ تھے۔

نمازِ مغرب کے وقت مسجد کا ہال حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ امامت کے فرائض ڈاکٹر اسرار احمد نے انجام دیے۔ قرآن پاک کی آیاتِ مبارکہ تلاوت کرنے میں ان کے لحن میں سوز داؤدی ابھر آیا تھا۔ نماز سے فارغ ہوئے تو ایک مختصر تقریر میں جہیز اور ولیمہ کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ پھر خطبۂ نکاح پڑھا اور بس ان کی بیٹی سلمہا بیاہی گئیں۔ اور یہ تقریب درود وصلوٰۃ کے درمیان اختتام پذیر ہوئی۔

ہمارے ہاں شادی بیاہ' موت اور ختنہ وغیرہ کی تقریبات ایک ہنگامہ' ایک مسلسل دردِ سر اور اسرافِ بیجا کا نشان بن چکی ہیں۔ ہزاروں مساجد' ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے کم وبیش روزانہ امام صاحبان اور مقرر حضرات اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں ان تقریبات سے متعلق بدعتوں کے خلاف دھواں دھار تقاریر کرتے ہیں لیکن عمل کے لحاظ سے کوئی شخص ٹس سے مس نہیں ہوتا' ہنگاموں کا دردِ سر اور اسرافِ بیجا کا عمل غیر مختتم طور پر جاری رہتا ہے۔ لیکن پاکستان میں کم از کم ایک بندۂ خدا نے قول وفعل کے تضاد سے بچتے ہوئے ایک ایسی مثال قائم کی ہے کہ میں دعا کرتا ہوں کہ اس پر گامزن ہونے کی ہر پاکستانی کو توفیق ارزاں ہو۔ آمین!''

☆ حوالہ جات وحواشی:

(۴۰) ڈاکٹر اسرار احمد' اسلام کی نشاۃِ ثانیہ.....کرنے کا اصل کام' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' فروری ۲۰۱۱ء' ص ۱۳۔

(۴۱) ایضاً' ص ۱۴۔ (۴۲) ایضاً' ص ۱۴۔

(۴۳) ایضاً' ص ۱۶' ۱۷۔ (۴۴) ایضاً' ص ۱۷۔

(۴۵) ایضاً' ص ۲۰۔ (۴۶) ایضاً' ص ۲۱۔

(۴۷) ایضاً' ص ۲۱۔ (۴۸) ایضاً' ص ۲۱' ۲۲۔

(۴۹)امام غزالیؒ کی کتاب ''تہافت الفلاسفہ'' کی طرف اشارہ ہے۔
(۵۰)امام ابنِ تیمیہؒ کی کتاب ''الردّ علی المنطقیین'' کی طرف اشارہ ہے۔
(۵۱)ڈاکٹر اسرار احمدؒ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ.....کرنے کا اصل کام' ص ۲۳۔
(۵۲)ایضاً' ص ۲۳' ۲۴۔
(۵۳)مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تصنیف ''اسلامی نظامِ حیات'' کی طرف اشارہ ہے۔
(۵۴)سید قطب شہیدؒ کی تصنیف ''العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام'' کی طرف اشارہ ہے۔
(۵۵)ڈاکٹر اسرار احمدؒ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ.....کرنے کا اصل کام' ص ۲۴' ۲۵۔
(۵۶)ڈاکٹر صاحب نے اس مقصد کے لیے ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی قائم کی۔
(۵۷)ڈاکٹر اسرار احمدؒ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ.....کرنے کا اصل کام' ص ۲۵۔
(۵۸)ڈاکٹر صاحب نے اس مقصد کے لیے ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور قائم کی جس کی شاخیں پاکستان کے کئی شہروں میں قائم ہوئیں۔ان انجمنوں کے تحت کئی شہروں میں قرآن اکیڈمیز قائم ہیں جو مطلوب علمی کام کے لیے سرگرم ہیں۔
(۵۹)ڈاکٹر اسرار احمدؒ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ.....کرنے کا اصل کام' ص ۲۶۔
(۶۰)ڈاکٹر اسرار احمدؒ رسولِ انقلابؐ کا طریق انقلاب' تنظیم اسلامی گڑھی شاہو لاہور' جون ۲۰۱۱ء' ص ۵۰۔
(۶۱)ایضاً' ص ۵۱' ۵۲۔ (۶۲)ایضاً' ص ۵۲' ۵۳۔
(۶۳)ابی جعفر محمد بن جریر طبری' تفسیرالطبری جامع البیان عن تاویل آی القرآن' سورۃ الحدید آیت ۱۲' مرکز البحوث والدرسات العربیۃ والاسلامیہ ' قاہرہ' الطبعۃ الاولیٰ' ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱م' جلد ۲۲' ص ۳۹۷۔
(۶۴) ڈاکٹر اسرار احمد' حقیقت و اقسامِ شرک' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' اکتوبر ۲۰۰۸ء' ص ۴۳ تا ۴۷۔
(۶۵)ایضاً' ص ۷۹' ۸۰۔ (۶۶)ایضاً' ص ۸۰۔
(۶۷)ایضاً' ص ۸۰' ۸۱۔ (۶۸)ایضاً' ص ۸۱' ۸۲۔
(۶۹)ارشادِ نبوی ﷺ ہے: ((اَعْلِنُوْا هٰذَا النِّكَاحَ وَاجْعَلُوْهُ فِي الْمَسَاجِدِ)) ''نکاح کا اعلان عام کیا کرو اور اسے مسجدوں میں منعقد کرو''۔ یہ ترمذی کی روایت ہے۔
(۷۰)ڈاکٹر اسرار احمد' ایک اصلاحی تحریک مع خطبہ نکاح' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' اپریل ۲۰۰۷ء' ص ۸۔
(۷۱)''میثاق''' تنظیم اسلامی کا ترجمان رسالہ ہے جو ہر ماہ شائع ہوتا ہے۔
(۷۲)ڈاکٹر اسرار احمدؒ ایک اصلاحی تحریک مع خطبہ نکاح' ص ۴۶' ۴۷۔
(۷۳)ایضاً' ص ۴۹' ۵۰۔ (۷۴)ایضاً' ص ۱۳۔

❁❁❁

قرآن کے حقوق اور ہمارے فرائض☆

بیگم ڈاکٹر عبدالخالق

حدیث مبارکہ ہے:

((اَلْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَكَ اَوْ عَلَيْكَ)) (صحیح مسلم و سنن الترمذی)

''قرآن پاک تمہارے حق میں یا تمہارے خلاف حجت ہوگا۔''

یعنی قیامت کے دن قرآن پاک ہمارے حق میں گواہی دے گا یا ہمارے خلاف۔ کیا منظر ہوگا جب ہمارے ہی گھروں میں پڑے ہوئے لاتعداد مصاحف ہمارے خلاف گواہی دے رہے ہوں گے کہ اے اللہ! تو نے دنیا میں جو ان مسلمانوں پر میرے حقوق فرض کیے تھے' انہوں نے ان حقوق کو ادا نہیں کیا۔ نہ ترجمہ سیکھا کہ قرآن کو سمجھ سکیں' نہ تجوید سیکھی کہ قرآن کو خوش الحانی سے پڑھ سکیں اور نہ ہی قرآنی احکامات پر عمل کیا —— ہمارا کیا خیال ہے کہ قرآن اللہ کے ہاں ہمارے حق میں گواہی دے گا؟ ہمیں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن تمہارے منہ بند ہو جائیں گے اور تمہارے اعضاء (ہاتھ' پاؤں' آنکھیں' کان) تمہارے خلاف گواہی دیں گے۔ تو جو ذات اعضاء کو زبان دے سکتی ہے وہ قرآن کو بھی قوت گویائی عطا کر سکتی ہے۔

''حُجَّةٌ عَلَيْكَ'' کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن تمہارے خلاف بولے گا کہ اے باری تعالیٰ! یہ لوگ دنیا بنانے کے لیے دنیا کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ انہوں نے غیر زبانیں سیکھیں' دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے لیے۔ ان کے بچوں کے بستوں میں ہر سال نئی نئی کتابوں کے خلاصے ہوتے' اور ساتھ ساتھ ان غیر زبانوں کو سمجھنے کے لیے ڈکشنریز بھی۔ یہ ڈاکٹر بن گئے' انجینئر بن گئے' سائنسدان بن گئے —— تو نے ان کو اپنی ایک کتاب ''قرآن'' کی شکل میں پوری زندگی کے لیے دی' لیکن افسوس یہ اس کو سمجھ نہ سکے۔ آج میں ان کے خلاف گواہی دے رہا ہوں۔ ان کا مواخذہ فرما!

☆مضمون کے تسلسل کے لیے ملاحظہ کیجیے: میثاق جون ۲۰۱۲ء۔

قرآن مجید کے کیا حقوق ہیں ہم سب پر؟ یہ شاید اُمت مسلمہ کی اکثریت کو معلوم نہیں۔ ان کو بس یہ معلوم ہے کہ موت یا مصیبت کے وقت سورۂ یٰسین پڑھنی ہے' کوئی فوت ہو جائے تو قرآن ناظرہ پڑھ کر بخشنا ہے اور اگر پڑھنے والے مناسب تعداد میں نہیں مل رہے تو قاری صاحب سے پڑھا پڑھایا قرآن خرید کر ثواب پہنچانا ہے۔ شادی بیاہ میں تمام خرافات' اسراف و تبذیر' نمود و نمائش' بے حیائی' میوزک کے ساتھ لچر گانے اور فضول رسومات مثلاً مایوں' مہندی' تیل' بارات' سلامیاں' جہیز' اس پر مزید غضب مخلوط محافل اور غیر مَردوں سے دلہن کے ادھورے لباس میں مووِیاں بنوا کر شیطان کو دل و جان سے راضی کر کے آخر میں رخصتی کے وقت لڑکی کو قرآن کے سائے تلے گزار کر ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن شاید اس کام کے لیے نازل ہوا ہے۔ حالانکہ ہم اپنے خلاف خود ہی حجت قائم کر رہے ہیں۔ غلط' بے حیائی اور گناہ کے تمام کام کرنے کے بعد دلہن کو قرآن کے سائے تلے رخصت کر کے ہم تو اسی وقت قرآن کی تعلیمات کے خلاف کام کر رہے ہوتے ہیں' اس کے خلاف ثبوت دے رہے ہوتے ہیں اور قرآن ہمارے خلاف گواہیاں اکٹھی کر رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح جھوٹی سچی قسم کھانے کے لیے قرآن پر ہاتھ رکھا ہوتا ہے۔

جب قول و قسم لینے کے لیے تکرار کی نوبت آتی ہے
پھر میری ضرورت پڑتی ہے' ہاتھوں پہ اٹھایا جاتا ہوں!

ہم سب لوگ' اِلا ماشاء اللہ' قرآن کے حقوق کی عدم ادائیگی اور حق تلفی کا باعث بن رہے ہیں۔ از روئے قرآن ہم پر جو قرآن کے حقوق عائد ہوتے ہیں' والد صاحب مرحوم و مغفور نے ان کو نہایت خوبصورت اور بھرپور انداز میں ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' نامی کتابچے میں مفصل درج کیا ہے۔ اس تحریر میں' میں آپ کے سامنے ان ہی حقوق کو مختصراً بیان کر رہی ہوں۔

ہر مسلمان پر قرآن مجید کے پانچ حقوق ہیں اور حقوق کو ادا کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ گویا یہ پانچ حقوق قرآن کے ضمن میں ہمارے فرائض ہیں۔

(۱) ایمان و تعظیم

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ﴾ (النساء: ۱۳۶)

''اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر' اور اس کے رسول پر' اور اس کتاب پر جو اس نے

اپنے رسول پر نازل کی‘ اور اس کتاب پر بھی جو پہلے نازل کی۔‘‘

ایمان اور تعظیم کا مفہوم یہ ہے کہ اس قرآن پر دل سے ایمان لا کر اس کی عزت کرنا اور اس کے احکام بجالانا۔ یہاں اِقْرَارٌ بِاللِّسَان سے آگے بڑھ کر تَصْدِیْقٌ بِالْقَلْب والا ایمان مقصود ہے۔ قرآن حکیم پر ایمان و تعظیم کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ کی شان بایں الفاظ بیان ہوئی ہے:

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ﴾ (البقرۃ: ۲۸۵)

’’ایمان لائے رسول اُس پر جو ان پر نازل ہوا ان کے رب کی طرف سے اور اہل ایمان (بھی ایمان لائے)۔‘‘

(۲) تلاوت و ترتیل

قرآن مجید کا دوسرا حق تلاوت و ترتیل ہے‘ یعنی اس کو ناظرہ‘ تجوید کے ساتھ اچھے لہجے سے پڑھنا۔ تلاوت کے معنی اس کو follow کرنے کے بھی ہیں اور قراءت کرنے کے بھی‘ جبکہ ترتیل کے معنی ہیں آرام آرام سے پڑھنا۔ روزانہ کا نصاب اور معمول بنا کر پڑھنا‘ پھر کچھ حصہ حفظ کرنا اور اسے نماز کا حصہ بنانا‘ یہ نہ صرف ہمارے فرائض میں سے ہے بلکہ حفظ اور ناظرہ قرآن پڑھنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان لہو و لعب‘ فضول لطائف اور زبان کی دوسری برائیوں سے محفوظ رہتا ہے۔ کتابِ الٰہی کے قدر دانوں کی کیفیت قرآن میں بایں الفاظ بیان ہوئی ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ﴾ (البقرۃ: ۱۲۱)

’’اور وہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی وہ اس کی ایسے تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ تلاوت کا حق ہے۔‘‘

(۳) تذکر و تدبر

تیسرے حق میں بھی دو چیزیں شامل ہیں‘ ایک تذکیر (یعنی قرآن کو سمجھنا) اور دوسری غور و فکر اور تدبر۔ سمجھنے کے اعتبار سے قرآن بہت آسان ہے‘ اس لیے اس کا ترجمہ پڑھ کر ہدایت کی طرف آنا مشکل نہیں۔ سورۃ القمر میں یکے بعد دیگرے چار بار ارشاد ہوا:

﴿وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ۝﴾

(آیات ۱۷‘ ۲۲‘ ۳۲‘ ۴۰)

’’اور یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا ہے‘ پس ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا!‘‘

دوسری چیز تدبر ہے‘ ارشاد ہوا:

﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۝۲۴﴾ (مُحَمَّد)

’’کیا یہ لوگ قرآن پر غور ہی نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟‘‘

تفکر و تدبر ہر ایک کے لیے مشکل ہے۔ ہدایت کی طرف آ جانے کے بعد تدبر کے لیے تفاسیر کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ ’’ہدایت انسانی‘‘ جو قرآن کا اصل موضوع ہے وہ قرآن سے تذکر یعنی صحیح ترجمہ پڑھ کر بھی اخذ کیا جا سکتا ہے‘ لیکن ہم نے جب نادانی اور جہالت میں قرآن کا مقصد ہدایت کی بجائے ایصالِ ثواب اور حصولِ ثواب سمجھ لیا تو اس کے آسان الفاظ کے معانی سے بھی ناآشنا ہو گئے اور کچھ ہمارے ’’بڑوں‘‘ نے بھی ان الفاظ کے اصل معانی اور عملی زندگی میں ان کا عمل دخل ختم کر دیا۔ قرآن حکیم میں ایسے الفاظ بارہا آئے ہیں جو تذکر کے مفہوم میں آتے ہیں لیکن ہم نے ان کو بالکل الگ مفہوم دے دیا ہے‘ مثلاً:

اسلام: قرآن میں اسلام یعنی شریعت پر عمل کو‘ خواہی نہ خواہی‘ لازم قرار دیا گیا ہے۔ مسلمان اصل میں تو ہے ہی وہ جو اللہ کا حکم آنے پر سرِ تسلیم خم کر دے۔ ہم بڑی بڑی عزیمتوں کی باتیں کرتے ہیں‘ لیکن شریعت کے کل حکم پر ہم (میری مراد دین دار لوگ ہیں) ابھی بھی عمل پیرا نہیں ہیں۔ کوئی ایک کام یا عبادت کچھ زیادہ کر کے ہم بھول جاتے ہیں کہ عمل کا میدان بھی شریعت میں شامل ہے‘ کیونکہ ’’شارع‘‘ کہتے ہیں راستے کو اور راستے پر چلا جاتا ہے‘ محنت کی جاتی ہے نہ کہ صرف زبانی کلامی حرکات و سکنات کی جاتی ہیں اور نہ ہی صرف راستہ یاد کیا جاتا ہے۔

اطاعت: اطاعت کے بارے میں خود نبی اکرم ﷺ کا قول ملاحظہ ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

’’قیامت کے دن میں اپنی اُمت کے ایک گروہ سے منہ موڑ لوں گا‘‘۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے فرمایا: یارسول اللہ! ایسے کون لوگ ہوں گے؟‘‘ آپؐ نے فرمایا: ’’یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے میرا راستہ (میرا طریقہ‘ میری شریعت) چھوڑ کر غیروں کے طریقے اپنائے ہوں گے۔‘‘ (صحیح مسلم)

ایک اور حدیث مبارکہ میں آپ ﷺ نے فرمایا:

’’میری اُمت کے تمام لوگ جنت میں داخل ہوں گے سوائے ان کے جو خود انکار کر دیں‘‘۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا: وہ کون لوگ ہوں گے جو خود (جنت میں جانے سے) انکار کر دیں؟ آپ ﷺ نے جواب دیا: ’’جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہو گا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے (گویا) خود (جنت میں

جانے سے) انکار کر دیا۔'' (صحیح مسلم)

اطاعت کا لفظ قرآن وحدیث میں بارہا آیا ہے' لیکن ہم اطاعت کو بھی صرف زبانی محبت کے دعووں سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ جب ہم ماں باپ کی اطاعت کے بارے میں کہتے ہیں تو ضرور وہ آداب بتاتے ہیں جو ان کی اطاعت کے ذیل میں آتے ہیں۔ مثلاً ان کا کہنا مانو' ان کا دل نہ دکھاؤ' ان کی خدمت کرو! تو کیا کہنا صرف منہ سے ہاں یا ناں کر کے مانا جاتا ہے یا پھر عملاً کہنا مان کر دکھایا جاتا ہے؟ ان کا دل نہ دکھاؤ! یعنی ایسی باتیں نہ کرو جن سے وہ رنجیدہ ہوں۔ اسی طرح خدمت سے ایک معقول شخص یہی مراد لے سکتا ہے کہ ان کے کام آؤں' ان کے ساتھ ہمدردی سے پیش آؤں' ایسے کام کروں جن سے والدین خوش ہوں وغیرہ وغیرہ۔ اس سے ہمیں اطاعت رسول کا مفہوم سمجھ میں آ سکتا ہے کہ ﴿اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ کا کیا مطلب ہے!

تقویٰ: قرآن کے نزول اور اس کے الہدیٰ ہونے کا فائدہ ہی قرآن کی رو سے متقین کو ہوتا ہے۔ لیکن تقویٰ کیا ہے؟ ہم نے اس کا مفہوم بھی بہت غلط لیا ہے۔ کسی نے ساری عمر شادی نہیں کرائی تو کہہ دیا کہ فلاں شخص بہت متقی ہے' کسی کے ہاتھ میں ہر وقت تسبیح رہتی ہو (خواہ ٹی وی دیکھتے وقت بھی ہو) اس کو متقی کہہ دیا جاتا ہے۔ غرض حلیوں پر' وضع قطع پر' طرزِ بود و باش پر ہم متقی کہہ رہے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ اَن گنت مرتبہ آیا ہے۔ تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کی پکار بھی ''اِتَّقُوا اللّٰہَ'' رہی ہے۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا: ((اُوْصِیْکُمْ بِتَقْوَی اللّٰہِ)) (سنن الترمذی' و سنن ابی داؤد) ''میں تمہیں اللہ کے تقویٰ کی نصیحت کرتا ہوں''۔ تو اگر قرآن کے تقاضے ''تقویٰ'' کو مندرجہ بالا مفہوم میں ڈھال لیں تو کیا ضرورت رہ جاتی ہے جہاد وقتال کی' جہاد بالنفس اور جہاد بالمال کی؟

درحقیقت تقویٰ کا مطلب ہے ''بچنا''۔ اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کا مطلب ہے: اللہ کی معصیت سے بچنا' اللہ کے غضب سے بچنا' اللہ کے عذاب سے بچنا۔ تو اصل مفہوم تقویٰ کا یہ ہوا کہ گناہوں سے' معصیت کے کاموں سے' گمراہیوں سے' بدعات سے' غلط رسومات سے اپنے آپ کو بچا بچا کر زندگی گزارنا۔ اگر مفسرین نے تقویٰ کا مطلب پرہیزگاری لیا ہے تو پرہیزگاری بھی گناہوں کے اجتناب ہی سے ہوتی ہے' کیونکہ نیکیوں کو تو اپنانے کا حکم دیا گیا ہے۔

اس کی مثال گرمی کے موسم میں شوگر کے مریض کی دی جا سکتی ہے کہ اگر وہ دوائی کھا رہا ہے' انسولین بھی لگا رہا ہے مگر ان چیزوں سے پرہیز نہیں کر رہا جن سے ڈاکٹر نے اسے منع کیا

ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ ''تقویٰ'' نہیں کر رہا۔ اس طرح اس کو دوائی اثر نہیں کرے گی بلکہ اس کی بیماری وہیں کی وہیں رہے گی۔ بالکل یہی حال تقویٰ کا ہے کہ انسان عبادت تو کر رہا ہے مگر گناہوں سے پرہیز نہیں کر رہا تو ہماری عبادات کا ہماری روح پر کوئی مثبت اثر نہیں ہوگا۔ جن گناہوں سے انبیاء کرام علیہم السلام نے بچنے کا حکم دیا اور اپنی قوموں کو روکا' ان کاموں سے رک جانا ہی اصل تقویٰ ہے۔

عبادت: قرآن کریم میں عبادت کا ذکر تقریباً ہر صفحے پر موجود ہے لیکن ہم نے کبھی غور ہی نہیں کیا کہ عبادت کا مفہوم کیا ہے؟ ہم ہر نماز کی ہر رکعت میں ''اِیَّاکَ نَعْبُدُ'' پڑھتے ہیں لیکن اس کا مفہوم نہیں سمجھتے۔ ہمارے ذہن میں عبادت کا مطلب نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ' وظائف' تسبیحات' نوافل' تہجد تک محدود ہے۔ لہٰذا ان عبادات میں آگے سے آگے بڑھ جانے کو کُل عبادت سمجھ کر فارغ ہو جاتے ہیں۔ یا کچھ صدقہ وخیرات کر دیا' رمضان میں روزے کھلوا دیے اور بس۔ لہٰذا ہم یہ سمجھتے ہیں کہ نماز پڑھ کر عبادت کر لی' اب ہم جو مرضی کریں' جیسے مرضی زندگی گزاریں۔ یہ لفظ ''عبادت'' کا اتنا بودا مفہوم ہے جیسے ایک ملازم اور غلام کو یکجا کر دینا۔ ہمیں قرآن کے الفاظ کا صحیح مفہوم سمجھنا چاہیے۔ ہم نے لفظ عبادت کا اتنا غلط مفہوم سمجھا اور سمجھایا ہے کہ ہمارا دین صرف اس ایک لفظ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے صرف مذہب بن کر رہ گیا ہے اور مذہب کا بھی صرف عبادات والا حصہ۔

آیئے عبد' عبادت' عبدیت' عابد اور معبود کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کریں' شاید کہ ہماری زندگی میں بھی عبدیت کا رنگ نمایاں ہونے لگے۔ عبد کا مطلب ہے ''غلام''۔ عرب معاشرے میں عبدیت اور غلامی کا تصور بہت زیادہ تھا۔ عبد وہ ہوتا تھا جس کو اُس کا آقا خرید کر گھر میں ڈال کر پوری طرح محکوم بنا لیتا تھا۔ وہ ایسا زرخرید غلام ہوتا تھا کہ نہ تو اپنی مرضی سے کچھ کر سکتا تھا اور نہ ہی اپنی کوئی خواہش پوری کر سکتا تھا۔ وہ مکمل طور پر اپنے آقا کی مرضی کے مطابق کام کرتا تھا۔ یہ غلامی کبھی بھی خوشی سے نہیں کی جاتی تھی' یہ جبراً غلامی تھی۔ ہم بھی اللہ کے عبد ہیں یعنی غلام۔ ہمیں ہمارے آقا' مالک' حاکم نے خریدا نہیں ہے بلکہ پیدا کیا ہے۔ ہم عبد ہیں اور وہ ذات معبود۔ ہم اس دنیا میں پیدا ہی اس لیے کیے گئے ہیں کہ صرف اُس کی غلامی کریں' اُس کی بندگی کریں۔ خود قرآن نے ہمارا مقصد تخلیق یہی بتایا ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾﴾ (الذّٰریٰت)

''اور ہم نے جنّوں اور انسانوں کو پیدا ہی اپنی عبادت کرنے کے لیے کیا ہے۔''

لیکن اللہ تعالیٰ اپنے عبد کی عبدیت جبراً نہیں بلکہ بہت پیار‘ محبت اور عاجزی سے چاہتا ہے اور ہمہ تن‘ ہمہ وجود چاہتا ہے۔ علماء نے عبدیت کی تشریح اس طرح کی ہے: **غایۃ الحب مع غایۃ الذل والخضوع** ”بے پناہ عاجزی وانکساری کے ساتھ حد درجے کی محبت“۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے آگے اپنے آپ کو گرا دینا‘ بچھا دینا اور شدید محبت کے ساتھ اللہ کی بندگی کرنا۔ شیخ سعدی نے کیا خوب کہا ہے ؎

زندگی آمد برائے بندگی زندگی بے بندگی شرمندگی!

اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کے لیے سب سے مناسب لفظ یہی ”عبد“ لگتا ہے۔ اور عبد کی بہترین مثال خود اللہ تعالیٰ نبی اکرم ﷺ کی دیتے ہیں۔ قرآن پاک کی کئی سورتوں کا آغاز ہی اللہ تعالیٰ اپنے سب سے پیارے بندے کو عبد کہہ کر کرتا ہے۔ مثلاً:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا .....﴾ (الاسراء)

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ.....﴾ (الکھف)

﴿تَبٰرَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ .....﴾ (الفرقان)

گویا عبدیت کی بہترین مثال خود نبی اکرم ﷺ ہیں۔ عبادت سے مراد اگر نماز‘ روزہ ہی ہوتا تو نبی پاک ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے کیا مشکل تھا؟ پھر ان کو اتنی پر مشقت زندگی گزارنے کی کیا ضرورت تھی؟ نماز روزہ تو گھر میں بھی ہو سکتا تھا اور کوئی دیکھ بھی نہ سکتا۔ پھر آپ ﷺ کو ستایا بھی نہ جاتا‘ ایذائیں بھی نہ دی جاتیں‘ آپؐ زخمی بھی نہ ہوتے‘ ہجرتیں بھی نہ کرنی پڑتیں اور اپنوں اور غیروں کی مخالفتیں بھی نہ سہنی پڑتیں۔

عبدیت کا مطلب عملی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل درآمد کرنا ہے۔ تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے اپنی اپنی اُمتوں کو ایک ہی سبق سکھانے کی کوشش کی ہے: ﴿یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ﴾ ”اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو“ یا ﴿اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاتَّقُوْہُ﴾ ”اللہ کی بندگی کرو اور اُسی کا تقویٰ اختیار کرو“۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو اپنی معرفت کے لیے یہی بات بتائی: ﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمْ﴾ ”اے لوگو! اپنے رب کی بندگی کرو“۔ ہم ہر نماز میں اللہ سے عہد کرتے ہیں: ”اِیَّاکَ نَعْبُدُ“۔ اس سے معلوم ہوا کہ دو نمازوں کے درمیان کا وقفہ بھی عبادت میں گزارنا چاہیے۔ یعنی اگر ہم عبد (غلام) ہیں اور نماز میں عبادت کرتے ہیں تو کیا نماز کے بعد ہم غلام نہیں ہوتے؟ کیا اس دوران ہم کسی اور کے غلام بن جاتے ہیں؟ دو نمازوں کے دوران ہمارا معبود کوئی اور ہوتا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر نافرمانی اور گناہ کا کیا کام؟ لیکن بندگی اور غلامی کرتے ہوئے

بھی ہمیں لرزاں و ترساں رہنا چاہیے کہ ہماری ٹوٹی پھوٹی غلامی ہمارے آقا کو پسند آ جائے۔

بندگی اور غلامی کو مزید واضح کرنے کے لیے ہم سورۂ یٰسین سے رہنمائی لیتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلَمْ اَعْھَدْ اِلَیْکُمْ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ ۚ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۶۰﴾ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِیْ ؕ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴿۶۱﴾﴾

”(اے بنی آدم!) کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی بندگی نہیں کرو گے‘ بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اور یہ کہ میری ہی بندگی کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔“

یہاں پر ”لَا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ“ اور ”اعْبُدُوْنِیْ“ قابل غور ہیں۔ شیطان کی بندگی سے کیا مراد ہے؟ اگر عبادت صرف نماز‘ روزے کا نام ہے تو کیا ہم میں سے کسی نے آج تک شیطان کی نیت کر کے نماز پڑھی یا روزہ رکھا؟ یا شیطان کے نام پر کچھ خرچ کیا؟ ہرگز نہیں!! تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ عبادت دراصل عملی زندگی کے اعمال کا نام ہے اور شیطان کی بندگی سے مراد شیطان کا اتباع اور اس کے فرمودات پر عمل ہے جو ہم میں سے ہر ایک کرتا ہے (اِلا ماشاء اللہ!) —— اللہ تعالیٰ نے اپنی غلامی اور اپنی بندگی کو صراطِ مستقیم کہا ہے۔

(۴) حکم و اقامت

قرآن مجید کا چوتھا حق حکم و اقامت ہے‘ یعنی اپنی ذات پر اس کے تمام احکام کو نافذ کرنا اور قائم کرنا۔ اقامت کا مطلب ہے اسلام کے مغلوب ہو جانے کے بعد‘ ایسی جماعت کے ساتھ جو دین کو اور قرآن کے احکام کو نافذ کرنے کی کوشش میں لگی ہو‘ شریک ہو جانا‘ اور اگر ایک اسلامی نظام قائم ہو تو اس کو قائم رکھنا۔ سورۃ الشوریٰ میں ارشاد ہے:

﴿شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ وَمَا وَصَّیْنَا بِہٖٓ اِبْرٰھِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰٓی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ ؕ﴾ (آیت ۱۳)

”اس نے تمہارے لیے دین کا وہ طریقہ مقرر کیا ہے جس کی نوح کو نصیحت کی تھی اور (اے نبی ﷺ!) جو ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے اور (وہی ہے) جس کی وصیت کی ہم نے ابراہیم کو اور موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔“

یہاں بھی قرآن کو قائم کرنے کے لیے دو جہتیں معین کر دی گئیں۔ ایک ”حکم“ یعنی اپنی ذات میں قرآن کا انسانِ مطلوب بن کر دکھانا (جو کہ اصل میں مطلوب ہے) اور دوسرا ”اقامت“۔ بہترین سیرت و کردار کے حامل لوگ (جن کی صفات سورۂ آل عمران کے آخری رکوع

میں‘ سورۃ النور کے پانچویں رکوع میں اور سورۃ المؤمنون کے آغاز میں بیان ہوئی ہیں) اکٹھے ہو کر مل کر ایسا نظام نافذ و قائم کرنے کی کوشش کریں جس میں یہ تمام اوصاف شامل ہو جائیں۔ (ان آیات کی تشریح والد محترم نے اپنے کتابچوں ’’اکتسابی اور شعوری ایمان‘‘ اور ’’نورِ فطرت اور نورِ وحی‘‘ میں کر دی ہے۔ اقامت دین کے حوالے سے ’’منہجِ انقلاب نبوی ﷺ‘‘ اور ’’حزب اللہ کے اوصاف‘‘ بہت خوبصورت کتابیں ہیں۔ ان کتابوں کا مطالعہ نہ صرف ہماری سوچ و فکر کی جلاء کا باعث بنے گا بلکہ عمل کی راہیں صحیح رخ پر متعین کرنے میں بھی مدد ملے گی۔)

(۵) تبلیغ و تبیین

قرآن حکیم کا پانچواں حق تبلیغ و تبیین ہے‘ یعنی یہ ذمہ داری جو نبی اکرم ﷺ نے ہمیں سونپی ہے کہ اس قرآن کو سچائی اور دیانت داری سے آگے پہنچانا ’’تبلیغ‘‘ ہے۔ اس میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہ کرنا اور اس کو کھول کر بیان کرنا ’’تبیین‘‘ ہے۔ نبی پاک ﷺ کا ارشاد ہے ((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً)) (صحیح البخاری و سنن الترمذی) ’’پہنچاؤ میری طرف سے خواہ ایک آیت ہی ہو۔‘‘

یہ تمام حقوق ہم پر قرآن مجید کے عائد ہوتے ہیں‘ جن کو اگر ہم احساس ذمہ داری سے ادا کریں گے تو قیامت کے دن قرآن ہمارے حق میں گواہی دے گا اور ہمارے حق میں حجت بن کر آئے گا‘ لیکن اگر ہم اس کی طرف سے کسی کوتاہی اور حق تلفی کے مرتکب ہوں گے تو یہ ہمارے خلاف حجت بنے گا۔ مندرجہ بالا تمام حقوق‘ حقوق اللہ‘ حقوق الرسول اور حقوق القرآن کو اکٹھا کریں تو یہ ایک ہی حق میں جمع ہو جاتے ہیں اور وہ ہے حقوق اللہ۔ یہ دراصل اللہ اور بندے کے درمیان حقوق و فرائض کی ایک کڑی ہے جس کو حقوق اللہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

اور جہاں تک تعلق ہے حقوق العباد کا تو وہ بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کے عائد کردہ ہیں جو اس نے انسانوں کے انسانوں پر ادا کرنا لازم کر دیا ہے۔ حقوق العباد ادا کرنا اتنا ضروری اور اہم ہے کہ اگر ہم اللہ کے حقوق میں کسی کمی بیشی کے مرتکب ہو جائیں تو وہ غفور و رحیم ذات معاف کرنے پر قادر ہے‘ جبکہ انسانوں کے حقوق چونکہ انسان ہی تلف کرتا ہے‘ لہٰذا جب تک وہ انسان جس کی حق تلفی ہوئی ہو‘ وہ معاف نہ کر دے اللہ بھی معاف نہیں کرتا۔ خود اپنے آپ کو چاہے ہم کتنا ہی متقی‘ پرہیزگار اور باعمل بنانے کی کوشش کیوں نہ کریں اگر قرآن و سنت اور شریعت کی رو سے عدل و انصاف سے اپنے فرائض ادا نہ کیے تو ہم نہ حقوق اللہ ادا کر سکتے ہیں اور نہ ہی حقوق العباد۔ (جاری ہے)

بقیہ: عرض احوال

پندرہ صدیاں پہلے یہ فیصلہ سنا دیا تھا کہ عیسائی اور یہودی کبھی تمہارے دوست نہیں ہو سکتے‘ البتہ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ پھر ایک جگہ فرمایا کہ تمہاری دشمنی میں یہودی بہت شدت رکھتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائی یہودی گٹھ جوڑ میں یہودی عیسائی حکومتوں کو کھلم کھلا اور زیر زمین سازشوں سے مسلمانوں کے خلاف جارحانہ رویہ اختیار کرنے کے لیے اکساتے ہیں۔ نائن الیون کا ڈرامہ رچانا‘ عراق میں W.M.D یعنی وسیع تباہی مچانے والے ہتھیاروں کی موجودگی کا جھوٹا پروپیگنڈا کر کے امریکہ سے حملہ کروانا‘ یہودیوں کی سازش کا ہی نتیجہ ہے۔ لہٰذا ان اسلام دشمن قوتوں سے برسرپیکار ہونے کے لیے امت مسلمہ کو سیاسی اور عسکری طور پر خود کو مضبوط کرنا ہوگا۔ وگرنہ امریکہ اور یورپ میں قرآن اور صاحب قرآن کی توہین ہوتی رہے گی اور ردعمل میں ہم اُن کو منہ توڑ جواب دینے کی بجائے اپنے ہی اثاثہ جات کو جلاتے رہیں گے اور وہ ہماری پہنچ سے بالا بالا استہزائیہ رویے اختیار کر رکھیں گے۔

ہم نے سطور بالا میں پاکستان میں مظاہروں کے دوران پرتشدد واقعات کی پرزور مذمت کی ہے‘ لیکن یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ صورت حال کو سنبھالنے میں حکومت نے بھی حد درجہ نااہلی اور بزدلی کا مظاہرہ کیا جس سے عوام کے غیظ و غضب میں اضافہ ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نمائندہ حکومت ہونے کی دعوے دار پاکستان پیپلز پارٹی اس خطہ کے مسلمانوں کا مزاج اور جذبات کو سمجھنے اور جاننے میں بری طرح ناکام رہی۔ وہ اس سارے عرصے میں دوسری مسلمان حکومتوں کا منہ دیکھتی رہی۔ یہاں کے لوگوں کا مذہب سے عملی تعلق اگرچہ کم ہے لیکن جذباتی لگاؤ عالم اسلام میں سب سے زیادہ ہے۔ خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ترکی میں ہوا۔ عرب اس سے براہِ راست متعلق تھے‘ لیکن تحریک خلافت ہندوستان میں چلی اور ایسی چلی کہ مہاتما گاندھی کو بھی اس کا حصہ بننا پڑا۔ لہٰذا عوامی ردعمل کی ایک وجہ حکومت کی نااہلی بھی ہے۔ حکومت اگر درج ذیل اقدامات کرتی تو شاید عوام کے غیظ و غضب میں کمی ہو جاتی اور قیمتی جانیں بچ جاتیں:

(۱) فوری طور پر امریکی سفیر کو طلب کر کے شدید احتجاج کیا جاتا۔

(۲) فلمساز اور ڈائریکٹر کی گرفتاری کا امریکہ سے مطالبہ کیا جاتا کیونکہ انہوں نے فلم کی dubbing میں مزید بددیانتی کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔

(۳) امریکی حکومت مطالبات تسلیم نہ کرتی تو امریکہ سے اپنے سفیر کو واپس بلایا جاتا اور امریکہ کے سفیر کو ملک سے نکلنے کا حکم دیا جاتا۔

(۴) وزیر خارجہ پاکستان حنا ربانی کھر امریکہ کا دورہ مختصر کر کے احتجاجاً واپس آ جاتیں۔ بدقسمتی سے محترمہ اس دوران امریکہ سے اتحاد اور دوستی کے بیان دیتی رہیں۔

(۵) پاکستان دہشت گردی کی جنگ میں امریکی اتحاد سے باہر آ جاتا۔ یہ ایک اچھا موقع تھا۔

(۶) صدر زرداری نیویارک کا دورہ منسوخ کر دیتے۔

(۷) پاکستان OIC کا اجلاس طلب کر کے عالم اسلام کے سامنے یہ مطالبہ رکھتا کہ عالمی سطح پر یہ قانون نافذ کیا جائے کہ انبیاء و رسل اور الہامی کتب کی توہین سنگین جرم ہوگا۔ دوسرے مسلم ممالک اس پر

راضی ہوتے یا نہ ہوتے پاکستان اپنا فرض ادا کرتا۔

(۸) میڈیا پر مذہبی دانشور قسم کے لوگوں نے بھی اوٹ پٹانگ باتیں کر کے لوگوں کے غم وغصہ میں اضافہ کیا۔ اس کی بجائے میڈیا پر مستند علماء کرام کو مدعو کر کے اس فلم کی کھلے انداز میں اور شدت کے ساتھ مذمت کی جاتی اور امریکی حکومت کے کسی نوع کے قدم نہ اٹھانے کی بھی مذمت کی جاتی۔ اس کے ساتھ علمائے کرام عوام کو سمجھاتے کہ اپنے جذبات کے اظہار میں اگر کوئی تخریبی کارروائی کرے گا اور معصوم لوگوں کے جان و مال کو نقصان پہنچائے گا تو اللہ اور رسول کی ناراضی مول لے گا۔

(۹) یوم عشقِ رسولؐ کی بجائے اسے ''تحفظِ ناموسِ رسالت'' کا نام دیا جاتا۔ اگر اس کے لیے کوئی دن طے کرنا ہی تھا تو اس سے پہلے امریکیوں کو یہاں سے رخصت کر دیا جاتا تا کہ یہ تاثر نہ پھیلتا کہ توہینِ رسالت کے باوجود حکومت امریکیوں کا تحفظ کر رہی ہے۔

بہرحال ساڑھے چار سال کے عرصے پر محیط موجودہ حکومت کی عوامی مسائل کے حوالے سے کارکردگی، اس کی لوٹ مار اور اہم ترین بات یہ کہ پاکستان اور اسلام کے حوالے سے ان کی غیر سنجیدگی اور لاتعلقی دیکھتے ہوئے حکومت سے ایسی توقعات رکھنا کہ وہ کوئی سنجیدہ طرزِ عمل اختیار کرتی اسے کوئی ہماری سادہ لوحی قرار دے سکتا ہے۔

آخر میں ہم اس سانحہ کے حوالہ سے یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ پاکستان کا الیکٹرونک میڈیا ایک بار پھر اپنوں کی بجائے غیروں کا ہمدرد نظر آیا ہے۔ ایک بار پھر یہود و نصاریٰ کے مفادات کو ترجیح دی گئی ہے اور ان کے ایجنڈے کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ اس بے ہودہ فلم کی نمائش کا ذکر اور اس کی مذمت خصوصاً شروع کے ایام میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ پھر یہ کہ یومِ عشقِ رسول ﷺ کو اگرچہ توڑ پھوڑ ہوئی، تخریبی کارروائیاں ہوئیں، ہم بھی اس کی شدید مذمت کر چکے ہیں۔ سارا دن یہ بدنما مناظر دکھائے جاتے رہے۔ لیکن پاکستان کی تاریخ کی جو سب سے بڑی ہڑتال ہوئی کہ گلے محلے کی پرچون کی دکانیں تک بند تھیں، اس کا ذکر سرسری ہوا، اور اہم ترین بات یہ کہ توڑ پھوڑ تو چند جگہوں پر اور زیادہ تر کراچی اور پشاور میں ہوئی، جہاں پہلے بھی پرامن دن کم ہی گزرتا ہے۔ اس کے علاوہ ملک بھر میں انتہائی پرامن اور لاکھوں افراد پر مشتمل بے شمار جلوس نکلے، گلی محلوں سے چھوٹے چھوٹے جلوس نکلے جو انتہائی پُرامن تھے، بعض جگہوں پر انسانوں کا سمندر دیکھا گیا لیکن ایک تنکا بھی نہ توڑا گیا، لیکن الیکٹرونک میڈیا میں سرے سے اس کی نمائش نہیں ہوئی۔ بالکل اسی طرح کا رویہ میڈیا مسلمانوں کے باہمی اختلافات کے حوالے سے کرتا ہے، مثلاً مسلمانوں کے مختلف مسالک کے درمیان نوے فیصد سے زائد اتفاقات ہیں لیکن میڈیا میں ہمیشہ وہ اختلافات جو دس فیصد سے بھی کم ہیں ان کا ذکر ہوگا۔ ہمارے نزدیک یہ میڈیا کی انتہا پسندی بلکہ دہشت گردی ہے۔ الیکٹرونک میڈیا پرسنز کو ہم انتباہ کرتے ہیں کہ وہ اتنی بصیرت پیدا کریں کہ انہیں آنے والے وقت کا کوئی اندازہ ہو سکے، اس لیے کہ اکیسویں صدی اسلام کی صدی ہے۔ میڈیا کو بھی اپنا قبلہ درست کرنا ہوگا۔ باطل کا سر کچلنے میں حق کا ساتھ دیں۔ اسی میں آپ کا بھی بھلا ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام

ڈاکٹر محمد رفیع الدین (مرحوم) کی معروف کتاب

قرآن اور علمِ جدید

کا ساتواں ایڈیشن شائع ہو کر منظر عام پر آ گیا ہے

کتاب کا موضوع

''قرآن اور علم جدید'' ڈاکٹر صاحب کی ایک معرکۃ الآراء تصنیف ہے جو درحقیقت علامہ اقبال کی کتاب ''خطبات'' ہی کے سلسلے کی ایک دوسری کامیاب کاوش ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے ناقابل تردید حقائق، دلائل اور مثالوں سے ان تمام فلسفوں اور نظریات کے تار و پود بکھیر دیئے ہیں جن کی بنیاد پر آج تک مختلف ممالک میں نظام ہائے حکومت قائم رہے ہیں۔

☆ عمدہ طباعت ☆ خوبصورت ٹائٹل کور ☆ اعلیٰ جلد بندی

☆ 583 صفحات ☆ قیمت 650 روپے

ڈاکٹر محمد رفیع الدین (مرحوم) کی درج ذیل تصانیف بھی دستیاب ہیں:

(1) Ideology of the Future — Price: Rs.500/-

(2) The Quran & Modern Knowledge — Price: Rs.500/-

(قرآن اور علم جدید کا انگریزی ترجمہ)

ہول سیلرز، پبلشرز اور بک سیلرز کے لیے خصوصی تعارفی قیمت

ملنے کا پتہ: ڈاکٹر رفیع الدین فاؤنڈیشن

36-K، ماڈل ٹاؤن، لاہور، فون: 042-35074598

ڈسٹری بیوٹر: پروگریسو بکس، اردو بازار، لاہور، فون: 042-37352795